اکتوبر ۱۹۸۷ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
ہدایت القرآن (۱۸)	مولانا محمد تقی امینی	۴
درسِ قرآن (سورۂ محمدؐ، قسط ۸)	ڈاکٹر اسرار احمد	۱۱
منشورِ اسلام (۷)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۲۵
حکمتِ اقبال (۷)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۳۹
نقطۂ نظر (مولانا آزاد اور وحدتِ دین)	مولانا اخلاق حسین قاسمی	۴۷
توضیح و تنقیح (مرویاتِ خطیب بغدادی)	نصرت علی اثیر	۵۴

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

بیسویں صدی عیسوی

میں صنم کدۂ ہند میں "احیائے اسلام" کی کوششوں پر ایک اہم تاریخی دستاویز

جماعتِ شیخ الہندؒ اور تنظیمِ اسلامی

- ابوالکلام "امام الہند" کیوں نہ بن سکے ؟
- "حزب اللہ" اور "دارالارشاد" قائم کرنے کے منصوبے بنانے والا "عبقریٔ وقت" کانگرس کی نذر کیوں ہوگیا !
- احیائے دین اور احیائے علم کی تحریکوں سے علماء کی بدظنی کیوں ؟
- کیا "اقامتِ دین" کی جدوجہد ہمارے دینی فرائض میں شامل ہے !
- حضرت شیخ الہندؒ کیا کیا حسرتیں لے کر اس دنیا سے رخصت ہوئے ؟
- علماءِ کرام اب بھی "متحد" ہو جائیں تو "اسلامی انقلاب" کی منزل دور نہیں !

❊ فرائض دینی کا جامع تصور ❊ رجم ❊ عورت کی دیت ، اور دیگر مسائل پر
ڈاکٹر اسرار احمد کی معرکۃ الآراء تحریروں اور خطبات کے علاوہ مؤرخِ اسلام مولانا سعید احمد اکبر آبادی ، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری ، مولانا افتخار احمد فریدی ، مہاجر کابل قاری حمید انصاری ، پروفیسر محمد اسلم ، مولانا محمد منظور نعمانی ، مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی ، مولانا محمد زکریا ، مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری اور دیگر نامور علماءِ کرام اور اہلِ علم حضرات کی تحریروں پر مشتمل تاریخی مرقع

امیر تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے مبسوط مقدمے کے ساتھ

• ضخامت ۴۵۶ صفحات (نیوز پرنٹ) • قیمت -/۴۰ روپے

"میثاق" اور "حکمتِ قرآن" کے مستقل خریداروں کو یہ کتاب ۲۵ فیصد رعایت پر مبلغ -/۳۰ روپے بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک پیش کی جائے گی ۔ ڈاک خرچ ادارے کے ذمے ہوگا ۔

نوٹ : کتاب چھپ کر آگئی ہے ۔ کراچی کے خریدارانِ "میثاق" و "حکمتِ قرآن" یہ کتاب کراچی آفس (داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت) سے بارعایت حاصل کر سکتے ہیں ۔

ملنے کا پتہ :

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ، ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا

(البقرہ : ۲۶۹)

ماھنامہ حکمتِ قرآن لاھور

جاری کردہ : ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ ۔ مرحوم

مدیر اعزازی : ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی ،

معاون مدیر : حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

مینجنگ ایڈیٹر : اقتدار احمد

جلد ۶ — اکتوبر ۱۹۸۷ء بمطابق صفر المظفر ۱۴۰۸ھ — شمارہ ۱۰

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاھور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاھور ۱۴۔ فون: ۸۵۲۶۱۱

کراچی آفس : ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بخاری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون -/۴۰ روپے فی شمارہ -/۴ روپے

مطبع : آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

محمد موسیٰ بھٹو کی شخصیت پاکستان کے اخبار بین طبقات کے لیے محتاجِ تعارف نہیں۔ موصوف کا شمار ہمارے ملک کے اُن معدودے چند دانشوروں میں ہوتا ہے جو دین و مذہب کو ہر دوسری شے پر مقدم رکھتے ہیں اور جن کی علم و دانش کا تمام تر مصرف محض خدمتِ دین ہی ہوتا ہے۔ سندھ میں لادینی افکار و نظریات کی یلغار کا مقابلہ جس جرأتِ مردی سے یہ درویش صفت نوجوان کر رہا ہے وہ بلاشبہ قابلِ رشک ہے۔ انہیں دیکھ کر اس حقیقت پر یقین گہرا ہو جاتا ہے کہ اگر خلوصِ نیت اور جذبۂ عمل کا سرمایہ موجود ہو تو وسائل کی کمی کام کی راہ میں آڑے نہیں آیا کرتی۔

سابقہ شمارے میں "اسلام کی تاریخ میں عقل اور نقل کی کشمکش" اور "برصغیر میں علی گڑھ اور دیوبند کے دو متضاد مکاتبِ فکر کا قیام اور ان کے مابین چند درمیانی راہیں" کے زیرِ عنوان محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے جو دو نہایت قیمتی مقالے شائع ہوئے تھے اُن پر محترم موسیٰ بھٹو صاحب کا ایک خط ہمیں موصول ہوا ہے جو ہم قارئین کی نذر کر رہے ہیں۔ محترم موسیٰ بھٹو کے اس خیال کے بارے میں کہ مولانا مودودی مرحوم و مغفور کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی پرانی تحریروں میں خاصی تلخی پائی جاتی ہے، ہم یہ عرض کریں گے کہ اُس وقت ڈاکٹر صاحب کے لیے مولانا کی تحریکِ اسلامی کے غلط سمت مڑ جانے کا صدمہ تازہ تھا، زخم کی دکھن کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی تھی جس کا اظہار اُن تحریروں میں ہوا ہے۔ اب اگر ڈاکٹر صاحب مولانا مرحوم کا ذکر تحریر و تقریر میں کرتے ہیں تو اندازِ تلخی اور تندی کی بجائے تأسف اور حسرت کا سا ہوتا ہے۔ اس معاملے کی وضاحت خود محترم ڈاکٹر صاحب بھی اپنی کتاب 'اسلام اور پاکستان' کے دیباچے میں فرما چکے ہیں جو شاید محترم مکتوب نگار کی نظر سے نہیں گزری۔ موسیٰ بھٹو صاحب کا مکتوب پیشِ خدمت ہے۔

محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

السلام علیکم مزاج شریف

"حکمتِ قرآن" کے ستمبر ۱۹۸۷ء کے شمارے میں آپ کے دو مضامین "تاریخ اسلام میں عقل اور نقل کی کشمکش کے دو اہم ادوار" اور "علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین چند درمیانی راہیں" پڑھ کر آپ کے علمی مزاج اور تجزیاتی صلاحیت کا اندازہ ہوا اور آپ سے عقیدت میں اضافہ ہوا۔ البتہ مولانا مودودی کی شخصیت اور ان کے کام کے بارے میں آپ کی رائے میں کچھ جارحیت اور سختی پائی جاتی ہے جس کا "حکمتِ قرآن" اور "میثاق" کی تحریروں میں اکثر مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔ میری عاجزانہ التماس ہے کہ سب کو اپنے اپنے دائروں میں کام کرنے اور دینی جماعتوں کو باہم رواداری کا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے۔ اسی میں دین اور ملک و قوم کی بھلائی ہے۔

آپ کی علمی صلاحیتوں کو دیکھ کر رہ رہ کر یہ خیال آتا ہے کہ آپ انقلاب کو مقصود بنا کر کام کرنے کی بجائے اگر اپنا قیمتی وقت علمی کام میں صرف فرماتے اور اپنے حلقہ سے وابستہ افراد کی تربیت کا گہرا نظام تشکیل دے دیتے تو اس سے جہاں اسلام کے کاز کو زیادہ تقویت حاصل ہوتی وہاں آپ کی صلاحیتوں کا صحیح مصرف بھی ہوتا۔ آپ اگر اب بھی اپنی حکمت عملی اور طریق کار میں تبدیلی فرمائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے حالات میں وہ زیادہ مؤثر ثابت ہو گا۔

آپ دین کے لئے جس لگن، حرکت اور سرگرمی سے شب و روز مصروف ہیں، راقم اس کا دلی طور پر قدر دان ہے۔ حیدر آباد میں سرفراز احمد خان صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر اسرار احمد نے کچھ وقت پہلے ہفتہ میں ایک بار شب بیداری کا پروگرام رکھا تھا، یہ پروگرام تقریباً چھ سات ماہ تک چلتا رہا، اس کا مجھے یہ فائدہ ہوا کہ تہجد زندگی کا معمول بن گیا ہے۔

راقم کی دلی آرزو ہے کہ آپ تربیت کا یہ سلسلہ دوبارہ شروع کریں اور کم از کم ہر تین چار ماہ میں ملک بھر کے کارکنوں کا بھی اسی طرح کا تربیتی پروگرام رکھیں تاکہ خصوصی تعلق باللہ اور عبادت سے شغف کارکنوں کا وظیفہ بن جائے۔ اس سے ان کی عملی زندگی میں غیر معمولی انقلاب پیدا ہو جائے گا۔

والسلام اختر

محمد موسیٰ بھٹو

سندھ نیشنل اکیڈمی۔ حیدر آباد

مولانا محمد تقی امینی

قوم بنی اسرائیل کی احسان فراموشی و گمراہی

— گزشتہ سے پیوستہ —

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم آپ کا یقین نہیں کریں گے جب تک ہم اللہ کو روبرو دیکھ نہ لیں[1] اس وقت تمہیں کڑک کی آواز نے آلیا۔ پھر ہم نے تمہیں تمہاری موت کے بعد اٹھا کھڑا کیا تاکہ تم شکر کرو[2]۔

O

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معافی تلافی کے بعد قول و قرار کی مضبوطی کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ستر مانے ہوئے لیڈروں کو طور پہاڑ پر لے گئے۔ (جس طرح آج کل قول و قرار مسجد یا کسی مقدس جگہ میں لیا جاتا ہے) لیکن ان سے وہاں بھی کچھ بدعنوانی ہوئی اور یہ کہدیا کہ ہم تو آپ کا یقین اس وقت کریں گے جب کہ اللہ کو اپنے سامنے بولتا ہوا دیکھ لیں۔ یہ کہنا تھا کہ طور پہاڑ میں زلزلہ کی سی کیفیت پیدا ہوئی اور ایک زوردار کڑاکے کی آواز نے ان کو اس قدر دہشت زدہ کر دیا کہ ان پر موت کی حالت طاری ہوگئی۔ پھر حضرت موسیٰ کی دعا سے وہ حالت دور ہوئی۔ ان کے ہوش و حواس درست ہوئے اور اس قابل ہوئے کہ بحیرت واپس آسکیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی سمجھ بوجھ ابھی کس قدر خام تھی۔ کس وقت وہ کیا کہہ بیٹھیں اور کیا کر بیٹھیں؟ ان کا کوئی اعتبار نہ تھا۔ یہ خام سمجھ بوجھ ہر اس قوم کی ہوجاتی ہے جو عرصہ تک پستی و ذلت کی حالت میں زندگی گذارتی ہے۔ اس کو کھڑا کرنے کی کوشش میں کیسی کیسی مشقتیں جھیلنی پڑتی ہیں اور کیسی کیسی باتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں اس کا اندازہ نبیوں اور رسولوں کی زندگی دیکھ کر ہوتا ہے۔ یہ حضرات بڑے دل گردے کے ہوتے

ہیں۔ سب کچھ جھیل کر اور سب کچھ سہہ کر قوم کو آگے بڑھاتے اور ترقی کی راہیں دکھاتے ہیں ــــ!

ٹلہ وہ دہشت سے مر گئے تھے یا بیہوش ہو گئے تھے۔ اس میں دونوں کی گنجائش ہے۔ موت کا لفظ قرآن میں بیہوشی پر بھی بولا گیا ہے۔ اور مر جانے پر بھی بولا گیا ہے۔ اللہ کی شکرگذاری کی بات دونوں صورتوں میں ہے۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ تا يَظْلِمُونَ

اور ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر من اور سلویٰ اتارا[1] جو کچھ ہم نے پاکیزہ چیزیں دی ہیں ان میں سے کھاؤ اور انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہیں کیا بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے[2]

○

لہ سمندر پار کرنے کے بعد بنی اسرائیل کو سیناء کے بے آب وگیاہ جنگل سے سابقہ پڑا جہاں دھوپ کی غیر معمولی شدت تھی۔ سایہ کا نام ونشان نہ تھا۔ اللہ نے ان پر ابر کا سایہ کیا وہاں غذا کا کوئی انتظام نہ تھا بس شکار اور ساتھ کے مویشی تھے۔ اللہ نے ان کے لئے قدرتی غذا کا انتظام کیا جس کی صورت یہ تھی کہ اسی جنگل کی کسی وادی میں کچھ جھاڑیاں تھیں۔ جن سے اوس کی طرح کوئی چیز ٹپکتی اور زمین پر گوند کی شکل میں جم جاتی تھی۔ اس کو "ترنجبین" سے بھی مشابہت دی جاتی ہے۔ اسی کو آیت میں "مَنّ" کہا گیا ہے جو اس جنگل میں اللہ کا خاص انعام واحسان تھا۔ اسی طرح بٹیر کی شکل کے پرندوں کو ان سے مانوس کر دیا تھا بڑی آسانی سے پکڑ کر اپنی خواہش کے مطابق ان کو غذا کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اسی کو آیت میں "سلویٰ" کہا گیا ہے۔

یہ نہایت سادہ زندگی تھی جس سے بنی اسرائیل سیناء کے جنگل میں دوچار ہوئے اور کافی عرصہ تک انہیں یہی سادہ زندگی گذارنی پڑی۔ غلامی وذلت کی زندگی سے نکل کر اونچا مقام حاصل کرنے کے لئے ہر قوم کو ابتداء میں سادہ زندگی ضروری ہوتی ہے۔ اس کے بغیر نہ وہ خرابیاں دور ہوتی ہیں جو غلامی وذلت کی زندگی میں پیدا ہو جاتی ہیں اور نہ زندگی کی وہ

تربیت ہو پاتی ہے جو اونچا مقام حاصل کرنے کے لئے درکار ہوتی ہے ۔
[1] ابتدائی یہ زندگی نہایت احتیاط سے اور سنبھل سنبھل کر گذاری جاتی ہے
لیکن پرانی عادتیں بڑی مشکل سے چھوٹتی ہیں ۔ بنی اسرائیل اس وقت اور ایسی قدرتی نعمتوں
کے انتظام کے باوجود ناشکری و نافرمانی سے باز نہ آئے اور اپنا ہی نقصان کرتے رہے ۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا تا بِمَا كَانُوا يَفْسُقُوْنَ

اور جب ہم نے کہا اس بستی میں داخل ہو جاؤ ۔ پھر اس میں جہاں سے چاہو فراغت
کے ساتھ کھاؤ اور دروازہ میں عجز و نیازمندی کی گردن جھکائے ہوئے داخل ہو
اور کہتے جاؤ اے اللہ مجھے بخش دے تو ہم تمہارے قصور معاف کر دیں گے ۔
اور فرمانبرداروں پر ہم مزید فضل کریں گے [2] پھر اپنے اوپر ظلم کرنے والوں نے
اس بات کو جو اُن سے کہی گئی تھی دوسری بات سے بدل دیا پھر ہم نے ان ظالموں
پر ان کی نافرمانی کی وجہ سے آسمان سے عذاب بھیجا ۔

○

[1] سینا کے جنگل میں من و سلویٰ جیسی قدرتی نعمتیں مہیا ہونے کے باوجود بنی اسرائیل
سے کہا گیا کہ اگر اپنی خواہش کے مطابق غذا چاہتے ہو تو قریب کی سرحدی بستی میں چلے جاؤ
وہاں تمہیں خواہش کے مطابق غذا مل جائے گی لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ وہاں
کبر و غرور اور سرکشی میں نہ مبتلا ہونا بلکہ پھاٹک میں داخل ہوتے وقت اللہ کے حضور
عجز و نیازمندی کا سر جھکائے رہنا اور زبان سے توبہ و استغفار کرتے ہوئے جانا ۔
بنی اسرائیل نے اس ہدایت پر عمل کرنے کے بجائے اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا اور
توبہ و استغفار کے بجائے اللہ کی جناب میں بے ادبی و گستاخی کے کلمات کہنے لگے اور
سرکشی میں مبتلا ہو گئے ۔ جس کے نتیجہ میں اللہ کا عذاب آیا اور کافی لوگ ہلاک ہو گئے ۔

[2] قرآن میں نہ بے ادبی و گستاخی کے کلمات کا ذکر ہے نہ اس بستی کا نام ہے نہ اس
میں داخل ہونے کا ذکر ہے اور نہ اس واقعہ اور دوسرے تاریخی واقعات میں
چھوٹی چھوٹی باتوں کی تفصیل بیان کرنا قرآن کے پیشِ نظر ہے ۔ البتہ مفسرین نے

بائیبل وغیرہ کے حوالے سے ہر ایک کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً توبہ کا کلمہ "حطۃ" کی بجائے "حنطۃ فی شعیرۃ" (بالی میں دانہ)، سرحدی بستی کا نام "سطیم" جس میں وہ حضرت موسیٰ کے زمانہ میں داخل ہوئے اور وہاں بدکاریاں کیں اور "عذاب" سے مراد طاعون ہے جس میں بہت سے لوگ ہلاک ہو گئے۔

اس واقعہ میں بنی اسرائیل کو یہ دکھانا ہے کہ ابھی ان کی زندگی کی سطح کتنی پست ہے! اور سرداری و سربلندی کی منزل ابھی ان کے لئے کتنی دور ہے! اسی طرح دنیا کی قوموں کو یہ بتانا ہے کہ زندگی کی اس سطح کو سمجھنا آسان نہیں ہے جس سے وہ سرداری و سربلندی کے قابل بنتی ہے۔ قوموں کی زندگی میں بے شمار مواقع ایسے آتے ہیں کہ جہاں تھوڑی بہت فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور جیسے جیسے ان میں کامیابی ہونے لگی بس وہ خود فریبی میں مبتلا ہو گئیں اور اللہ کے بارے میں اور خود اپنے بارے میں طرح طرح کے قیاسات اور غلط اندازے کرنے لگیں حالانکہ یہ صرف اوپر کی سطح ہوتی ہے جبکہ اللہ کے یہاں فیصلہ کن نیچے کی سطح بنتی ہے جس کا تعلق کردار اور معاملات کی درستگی سے ہے یعنی اگر اندر کا ظرف نہیں تیار ہوا اور لوگ اپنے کردار اور باہمی معاملات میں درست نہیں ہوئے تو باہر کی دنیا میں کتنا ہی شور ہنگامہ کرتے رہیں۔ قدرت کی نظر میں وہ سرداری و سربلندی کے قابل نہیں بنتے ہیں۔

بنی اسرائیل عرصہ تک غلامی و پستی اور ذلت و حقارت کی زندگی گذارتے رہے۔ سینار کے جنگل میں قدرتی نعمتیں پانے کے بعد خود فریبی میں مبتلا ہوئے اور بے قابو ہو گئے۔ اللہ نے ان کی جانچ کے لئے ایک موقع فراہم کیا کہ شہر جاؤ اور دیکھو کہ تم نے کس قدر اپنے کو سرداری و سربلندی کے "قابل" بنایا ہے۔ چنانچہ وہ شہر گئے اور جاتے ہی ان کی "پول پٹی" کھل گئی۔ پھر اسکے بعد دوبارہ انکو سینار کے جنگل میں واپس ہونا پڑا۔ یہ موقع ترقی کی جدوجہد میں ہر قوم کو ملتا ہے۔ جس سے اس کی جانچ ہوتی ہے اور خود فریبی اور غلط اندازوں کا پردہ چاک ہوتا ہے۔ لیکن بہت کم قومیں ہیں جو اس سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ ... مُفْسِدِيْنَ

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی کی درخواست کی تو ہم نے کہا کہ اپنے عصا کو پتھر پہ مارو پھر اس سے ۱۲ چشمے بہہ پڑے۔ ہر گروہ نے اپنا گھاٹ پہچان لیا

(ہم نے کہا) اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے کھاؤ اور پیو اور زمین میں فساد مچاتے

نہ پھرو۔

○

ے غذا کے ذکر کے بعد یہ پینے کے پانی کا ذکر ہے۔ سیناء کے جنگل میں دونوں ہی کی ضرورت تھی جس طرح حضرت موسیٰ نے غذا کے لئے دعا کی تھی پانی کے لئے بھی دعا کی تھی۔

۲ے پتھر سے پانی بہہ پڑنا چٹانوں سے چشمہ جاری ہو جانا اب کوئی معجزہ نہیں رہا لیکن جس وقت اور جس طرح یہ واقعہ ہوا بے شک وہ "معجزہ" تھا۔ جنگل و بیابان میں جہاں پانی کا نام و نشان نہ تھا کسی ایک چٹان یا پتھر کی نشاندہی کرنا اور اس پر عصاء سے ضرب لگانے کا حکم دینا اور پھر ضرب لگانے سے چشمہ کا جاری ہو جانا۔ ایک دو نہیں بارہ چشمے یقیناً ایسی بات ہے جو عام سطح سے بلند اور قدرت کے عام قانون کے خلاف ہے۔ اس کا تعلق اس خاص قانون یا قانون کی دوسری قسم سے ہے جس کا ذکر اوپر آیت وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ میں ہو چکا ہے اور انسان کی دسترس سے باہر ہے۔ رہی یہ بات کہ حضرت موسیٰؑ کو وہ پتھر معلوم تھا اور اس سے چشمہ نکلنا بھی ان کے علم میں تھا مگر عصاء کو ایک بہانہ بنایا گیا تاکہ یہ واقعہ "معجزہ" کہلائے اور بنی اسرائیل کو مرعوب کر کے ان کو جھکنے پر آمادہ کیا جائے۔ اس قسم کی چالبازی و بہانہ بازی ہماری مکر و فریب کی زندگی کے "کرتب" ہیں نبوت کی زندگی مکر و فریب کے ان "کرتبوں" سے پاک و صاف ہوتی ہے۔ جب اللہ سے تعلق ٹوٹتا یا کم ہوتا ہے تو ان کرتبوں کا رواج زیادہ ہو جاتا ہے اور جب اللہ سے تعلق مضبوط ہوتا ہے تو پھر ان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اللہ کی مدد ایسے مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتی ہے جن کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔

بارہ۱۲ چشمے بنی اسرائیل کے بارہ۱۲ قبیلوں کی مناسبت سے ہیں اور اس لئے ہیں کہ پانی کی خاطر آپس میں لڑائی جھگڑا نہ کریں۔ ان بارہ چشموں کا ذکر تورات میں بھی ہے اور سیاحوں نے بھی ان کی تصدیق کی ہے۔

جو نعمتیں خالص عطیۂ خداوندی ہوتی ہیں۔ جن کو حاصل کرنے میں زیادہ محنت اور کد و کاوش کی ضرورت نہیں پڑتی ہے ان کے ذریعے دراصل اللہ کی طرف سے ذلت و پستی کے کام چھوڑنے

اور ترقی و سربلندی کے کام اختیار کرنے کا خاص موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر قدرتی غذا اور پانی کے انتظام کے بعد فرمایا گیا کہ ہماری دی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ پیو۔ اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی حالت درست کرلو۔ فتنہ و فساد چھوڑ دو جس کی بدولت اب تک تمہاری زندگی تباہ ہوتی رہی ہے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى تا مَا سَاَلْتُمْ

اور جب تم نے کہا اے موسٰی ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر ہرگز بس نہ کریں گے۔ آپ ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمارے لئے زمین کی پیداوار میں سے سبزی ترکاری، کھیرا ککڑی، گیہوں دال، لہسن اور پیاز پیدا کرے۔ موسٰی نے کہا کیا تم اس چیز کو لینا چاہتے ہو جو ادنیٰ ہے اس کے بدلے جو اعلیٰ ہے۔ کسی شہر میں چلے جاؤ تمہیں وہ سب مل جائے گا جس کو تم مانگتے ہو۔

O

بنی اسرائیل سیناء کے جنگل میں من و سلویٰ کھاتے کھاتے اکتا گئے تھے ان کو ان چیزوں کے کھانے کی بیچینی ہوئی جو غلامی کے زمانہ میں پہلے کھایا کرتے تھے۔ آیت میں بتایا گیا ہے کہ ذلت و پستی کی جگہ عزت و سربلندی کی زندگی کی ایک قیمت ہے جس کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ قیمت پچھلی زندگی کی کمی کو دور کرنے اور اگلی زندگی کے قابل بنانے کے لئے ہوتی ہے۔ اس قیمت کی ادائیگی میں بڑی چیز کی خاطر چھوٹی چھوٹی چیزوں کو چھوڑنا اپنے فائدہ اور اپنی پسند کی چیزوں کو قربان کرنا راہ کی ہر تکلیف و مصیبت کو جھیلنا سبھی شامل ہے۔ پھر اگلی زندگی کا مقصد اگر عام سطح سے بلند ہوتا ہے تو اس کے حاصل کرنے کے لئے خاص قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور اسی کی مناسبت سے مشقت و قربانی کی شکلیں متعین ہوتی ہیں۔ بنی اسرائیل کو جس قسم کی قیادت و سرداری کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔ اس کے پیش نظر ان سے خاص قیمت کا مطالبہ تھا لیکن عرصہ تک ذلت و پستی کی زندگی نے ان کے کس بل نکال دیئے تھے۔ قولی عظمت و سرداری ان کے سامنے تھی لیکن اس کو حاصل کرنے کے لئے ان میں جوش و ولولہ باقی نہ رہا تھا۔ وہ ان کھانوں اور کمتر درجہ کی راحتوں کے لئے تڑپتے تھے جو غلامی و پستی کی زندگی میں انہیں حاصل تھیں اور ان کو وہ مشقتیں اور قربانیاں نہایت دشوار معلوم ہوتی تھیں جو ان کو عزت و سربلندی حاصل کرنے کی راہ میں پیش آ رہی تھیں۔ واقعات

سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ چیزیں من اور سلویٰ کی طرح وہ محنت و مشقت کے بغیر مفت چاہتے تھے۔

آیت میں "بقل" ہر قسم کی سبزی و ترکاری کو شامل ہے۔ "قثاء" کھیرا اور ککڑی دونوں کو کہتے ہیں۔ "فوم" اور "ثوم" لہسن کو کہتے ہیں۔ گیہوں کا ترجمہ بھی کیا جاتا ہے۔ "عدس" مسور کی دال کو کہتے ہیں۔ "بصل" صرف دال کا ترجمہ بھی کیا جاتا ہے۔ سب کو جمع کر دیا گیا ہے کہ ان کے پیش نظر یہ بھی چیزیں تھیں۔ مصر سے مراد خاص شہر نہیں بلکہ کوئی بھی شہر مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی تم میں قیادت و سرداری کی صلاحیت تو پیدا نہیں ہوئی جس کے لئے تمہیں تیار کیا جا رہا تھا۔ اگر ذلت و پستی ہی تمہارا مقدر بن چکی ہے تو اس تربیت گاہ (صحرائے سینا) سے نکل کر کسی بھی شہر میں چلے جاؤ۔ وہاں محنت و مشقت کرو جیسے پہلے غلامی کی زندگی میں کرتے تھے۔ یہ ساری چیزیں تمہیں مل جائیں گی۔

۶۱ آیت میں خاص طور سے ان قوموں کے لئے بڑی نصیحت ہے کہ جن کے سامنے بلند و برتر مقصد ہوتا ہے اور اس کی خاطر وہ قربانیوں اور مشقتوں کی بڑی قیمت دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے ہیں۔ وقتی فائدہ اور معمولی آرام کی زندگی کو وہ سب کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ ان کے مقصد کے مقابلہ میں جو اعلیٰ درجہ کا ہے یہ چیزیں نہایت ادنیٰ درجہ کی ہوتی ہیں۔ قوموں کی زندگی میں وہ وقت نہایت کٹھن ہوتا ہے جب کہ صحت کی بحالی سے پہلے مریض کی بے جا اصرار سے تنگ آکر اس کے "کیس" کو خدا کے سپرد کر دیا جائے۔ ابتداء میں اپنی مرضی و پسند کی کچھ چیزیں ملنے سے اسکو خوشی ضرور ہوتی ہے لیکن نتیجہ میں فوری ہلاکت ہو جاتی یا بیماری طول پکڑ لیتی ہے اور کبھی ایسی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے کہ مدتوں سسک سسک کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی گذارنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

(جاری ہے)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

درسِ قرآن

(۸)

ڈاکٹر اسرار احمد

سورۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ترتیب و تسوید: جمیل الرحمٰن / عاکف سعید

گزشتہ سے پیوستہ

گذشتہ نشست میں ہم اس سورہ مبارکہ کی چوتھی آیت کا مطالعہ کر رہے تھے اور اس کا ایک حصہ ہی پڑھ پائے تھے کہ مقررہ وقت ختم ہو گیا اور بقیہ حصہ کا مطالعہ اگلی نشست کیلئے چھوڑنا پڑا۔ چوتھی آیت میں چونکہ نہایت اہم مباحث و موضوعات آئے ہیں اور اسی آیت کے ایک حصے کو بنیاد بناتے ہوئے منکرین حدیث و سنت نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ قتال فی سبیل اللہ کے نتیجے میں اسیرانِ جنگ کو غلام بنانے کا کوئی تصور اسلام میں موجود نہیں ہے، اور ان کی یہ رائے چونکہ کتاب و سنت، تعامل صحابہ اور اجماع امت کے بالکل خلاف ہے لہٰذا ان کے اس موقف کی تردید اور ان کے استدلال کو غلط ثابت کرنے کے لئے مجھے اس مسئلہ کی وضاحت میں قدرے تفصیل سے جانا پڑا۔

سورۂ محمدؐ کا زمانۂ نزول

اس سورہ مبارکہ کے بارے میں جو چند بنیادی باتیں میں عرض کر چکا ہوں، ان میں ایک اہم بات اس کے زمانہ نزول سے متعلق ہے، جس کے پس منظر میں اس سورت کے مضامین کو بہتر طریق پر سمجھا جا سکتا ہے۔ مجھے ان مفسرین کرام کی رائے سے اتفاق ہے کہ جن کا خیال ہے کہ یہ سورہ مبارکہ غزوۂ بدر سے متصلاً قبل نازل ہوئی ہے..... میرا گمان ہے کہ سیرتِ مطہرہؐ میں جو واقعہ تفصیل سے بیان ہوا ہے کہ جس میں حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو یہ خبر دے کر مشورہ فرمایا تھا کہ ایک تو تجارتی قافلہ ابو سفیان کی سرکردگی میں شام سے شمال کی جانب واپس آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ معمولی سے چند محافظ ہیں اور مال تجارت

بہت ہے۔ گویا اس پر حملہ کیا جائے تو مال غنیمت بھی بافراط ملے گا۔ مزاحمت اور مقاومت (RESISTANCE) نہ ہونے کے برابر ہو گی چونکہ اس قافلہ کے ساتھ تیس اور پچاس محافظوں کی نفری ہے۔ دوسرے حضورؐ نے یہ فرمایا کہ جنوب یعنی مکہ کی جانب سے ایک لشکر کیل کانٹے سے لیس آ رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ان دو میں سے ایک پر وہ ضرور ہمیں فتح عطا فرمائے گا۔ اب بتاؤ کہ کدھر چلنا چاہئے!

________ کچھ لوگوں کی طرف سے یہ بات آئی کہ قافلہ کی طرف چلنا چاہئے۔ اس کا ذکر سورۃ الانفال میں آیا ہے اور اسے زیادہ نمایاں کیا گیا ہے، اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ غور و تدبر سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا یہ اسلوب ہے کہ کچھ اہم امور کے ضمن میں وہ چند لوگوں کی باتوں کو بھی اس طرح عمومی انداز میں بیان کرتا ہے کہ ایسا تأثر ملتا ہے کہ شاید عظیم اکثریت کی یہ رائے ہو ... حالانکہ اکثر صحابہ کرامؓ کی رائے وہی تھی جو حضورؐ کا رجحان تھا کہ لشکر کے مقابلے کے لئے چلا جائے اور اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی یہی تھی جیسا کہ سورۃ الانفال میں تفصیل سے آیا ہے۔

مشاورت میں تقاریر

میں پچھلی مرتبہ آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس موقع پر مہاجرین میں سے حضرت ابو بکر صدیقؓ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے پرجوش تقاریر کیں اور عرض کیا کہ حضورؐ بسم اللہ کیجئے جو آپؐ کا ارادہ ہو ..... حضرت مقدادؓ نے تو اپنی تقریر میں یہ تاریخی الفاظ ادا کئے کہ "حضور! آپؐ ہمیں حضرت موسیٰؑ کے ساتھیوں پر قیاس نہ فرمائیے جنہوں نے کہا تھا کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (کہ جاؤ تم اور تمہارا رب اور جنگ کرو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔) ہم تو آپؐ کے چشم ابرو کے اشارے کو اپنے حق میں حکم کا درجہ سمجھتے ہیں، جو آپؐ کی مرضی ہو بسم اللہ کیجئے۔ کیا عجب! ہمارے ذریعے سے آپؐ کو اللہ تعالیٰ آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما دے۔" لیکن اس کے باوجود ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضورؐ کسی چیز کے منتظر ہیں تو پھر انصار میں سے خزرج کے سردار حضرت سعد ابن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہ تاریخی تقریر کی جو میں گذشتہ نشست میں آپ حضرات کو تفصیل سے سنا چکا ہوں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے عرض کیا کہ حضور! ہم

نے آپؐ کو اللہ کا رسول تسلیم کیا ہے' ہم آپؐ پر ایمان لائے ہیں' اب ہمیں اپنے فیصلہ کا اختیار کہاں رہا! آپؐ کا روئے سخن اگر ہماری جانب ہے تو تردّد نہ فرمایئے جو فیصلہ بھی آپؐ فرمائیں گے وہ ہمیں بسروچشم قبول ہو گا' ..... حضرت سعدؓ کی تقریر سن کر حضورؐ کا چہرۂ انور خوشی سے کھل اٹھا اور قافلہ بدر کی طرف رواں دواں ہوا۔

میرے نزدیک اس سورۂ مبارکہ کے مضامین پر غور کرنے سے یہ داخلی شہادت بھی مل جاتی ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ اس مشاورت کے بعد نازل ہوئی ہے۔ یہ گویا ایک اعتبار سے فوری تمہید ہے غزوہ بدر کی جس کا موقع اب آنے ہی والا تھا۔ آیت نمبر ۴ کے ابتدائی الفاظ مبارکہ فَاِذَا لَقِیۡتُمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَضَرۡبَ الرِّقَابِ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جنگ کا مرحلہ بالفعل اب آنے ہی والا ہے..... اس سے پہلے اثنائے سفر ہجرت میں قتال کی اجازت آئی تھی' جو سورہ الحج میں مذکور ہے اور سورۃ البقرہ میں قتال کا حکم آ گیا تھا کہ "وَقَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ" اور "کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ" یعنی اے نبیؐ اور اے نبیؐ پر ایمان لانے والو! اب تمہاری دعوت و تحریک اس مرحلہ تک پہنچ گئی ہے کہ اب تمہیں جان ہتھیلی پر رکھ کر مشرکین سے قتال کے لئے میدان میں آنا ہو گا۔ پھر اسی سورہ میں جو ہمارے زیر مطالعہ ہے آپ دیکھیں گے کہ قتال کی ترغیب مختلف اسالیب سے آ رہی ہے اور مسلمانوں کا حوصلہ بندھایا جا رہا ہے کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے مشرکین کے اس لشکر کی معنوی حالت یہ ہو گی کہ ان پر تمہاری ہیبت و رعب طاری ہو گا اور تم ان کی گردنیں مار سکو گے فَضَرۡبَ الرِّقَابِ کی تشریح میں یہ تمام باتیں میں آپ کے گوش گذار کر چکا ہوں۔ نیز اس بات کی شہادت سورۃ الانفال کی آیات سے بھی پیش کر چکا ہوں۔ میں اس رائے کو درست سمجھتا ہوں کہ چونکہ یہ سورہ مبارکہ غزوہ بدر کی تمہید کے طور پر نازل ہوئی ہے' اسی سبب سے اس سورہ کا دوسرا نام "سورۃ القتال بھی ہے۔

حق و باطل کی ابدی کشمکش

میں عرض کر چکا ہوں کہ حق و باطل کی کشمکش و کشاکش ابد تک جاری رہے گی اس لئے کہ ابلیس لعین انسانوں کو اِغواء کرنے اور بہکانے کی مہلت بارگاہ الٰہی سے قیامت تک کے لئے لے کر آیا ہے۔

ذرا سیرت پر ایک نگاہ ڈالیں! حضورؐ کی حیات طیبہ میں فتح خیبر، فتح مکہ اور پھر ہوازن و ثقیف کے قبائل کے اسلام قبول کرنے کے بعد جزیرہ نمائے عرب کی حد تک دین اللہ غالب ہوگیا۔ گویا لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کی شان کا ظہور ہوگیا، جنگوں کا سلسلہ ختم ہوگیا اور سرزمین عرب کی حد تک حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا کی تکمیل ہو گئی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ اس کے بعد سلطنت روما سے ٹکراؤ شروع ہوا۔ ۸ھ میں غزوہ موتہ ہوا اور پھر ۹ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر تبوک ہے جو دراصل سلطنت روم سے ٹکراؤ کی تمہید ہے۔ پھر نبی اکرمؐ کی وفات کے فوراً بعد ایک طرف سلطنت روما سے باضابطہ مسلح ٹکراؤ شروع ہوا ہے تو دوسری طرف سلطنت ایران سے جنگوں کے سلسلہ کا آغاز ہوگیا۔..... حق و باطل کی یہ کشمکش و کشاکش، ہے اس کے متعلق جان لیجئے کہ یہ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک فیصلہ کن طور پر اسلام کا عالمی غلبہ نہیں ہو جاتا۔ میں نے ڈاکٹر اقبال مرحوم کا جو شعر آپ کو پہلے بھی سنایا ہے اور آج بھی سنا رہا ہوں، اس میں بڑی پیاری بات علامہ مرحوم نے کہی ہے کہ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرارِ بو لہبی

یہ کشمکش حضرت آدمؑ کے ہبوط ارضی کے وقت سے اس دنیا میں مسلسل ہوتی چلی آرہی ہے اور وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ کی سنتِ الٰہی کے مطابق اللہ تعالیٰ کبھی حق کو غلبہ عطا فرماتا تھا، پھر باطل کی قوتیں مجتمع ہوتی تھیں اور حق پس منظر میں چلا جاتا تھا اور باطل کی حکمرانی ہوتی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ حق کے غلبہ کے لئے کسی نبی رسول کو بھیجتا تھا اور یہ سلسلہ جاری تھا۔ اسی سلسلہ کی آخری کڑی ہیں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضورؐ آخری نبی اور آخری رسول ہیں، آپؐ کی رسالت کا دور قیامِ قیامت تک کے لئے ہے۔ لہٰذا عالمی سطح پر اللہ کے دین کے غلبہ کا معاملہ درحقیقت بعثت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے متعلق ہے۔ جس وقت تک یہ نہیں ہو جاتا اس وقت تک گویا حضورؐ کا مقصدِ بعثت آخری درجہ میں ابھی ثمر مندِ تکمیل ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

وقتِ فرصت کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

تیسرے خلیفۂ راشد شہید مظلوم امیر المومنین حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت کے ابتدائی آٹھ سالوں میں ایک طرف سلطنتِ کسریٰ ختم ہوئی، دوسری جانب سلطنتِ روما کے عمل دخل، اور اس کی حکومت کا مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں مصر سے لے کر مراکش تک خاتمہ ہو گیا۔ اس طرح اسلامی حکومت کی حدود ماوراء النہر میں بخارا، تاشقند، سمرقند حتیٰ کہ مکران تک پہنچ گئیں۔ لیکن یہودی سازش کی وجہ سے خلافت عثمانی کے دور کے آخری ساڑھے چار سال باہمی اختلافات، بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کی نذر ہوئے جس کے نتیجہ میں امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مظلومانہ طور پر شہید کر دیئے گئے۔ پھر یہودی اور مجوسی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے باعث چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قریباً ساڑھے چار سال کا دور خلافت باہمی خانہ جنگی میں گذرا اور ان جنگوں کے نتیجہ میں قریباً چوراسی ہزار مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں سے قتل ہوئے۔ اس وجہ سے اسلامی انقلاب کی توسیع کے حرکتی عمل کا زور (MOMENTUM) ٹوٹ گیا اور وہ صورت ختم ہو گئی کہ ؎ تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا..... بعد میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں یہ تعطل ٹوٹا اور انقلاب اسلامی کی توسیع کا عمل پھر شروع ہوا لیکن اس میں جذبۂ جہاد کی وہ شان باقی نہ تھی جو خلافتِ راشدہ کا طغرۂ امتیاز تھی۔ پھر بنوامیہ اور بنوعباس کی باہمی آویزشوں کا سلسلہ شروع ہوا جو بنوعباس کی کامیابی پر منتج ہوا۔ بنوعباس کی خلافت کا خاتمہ ہوا تو ترکان عثمانی کی حکومت کا دور شروع ہوا جو ۱۹۲۲ء میں اس طور پر ختم ہوا کہ نہ صرف سلطنت عثمانیہ پارہ پارہ ہوئی بلکہ پورے کرۂ ارضی پر تمام مسلم مملکتیں کسی نہ کسی انداز سے یا تو مغربی استعمار کا براہ راست نوالہ بن کر ان کی غلام و محکوم ہو گئیں یا مغربی طاقتوں کے زیرِ انتداب آ گئیں۔

مسلم مملکتوں کا قیام

اس مکمل زوال و انحطاط اور مغلوبیت سے قبل بنوامیہ سے لے کر ترکانِ عثمانی تک کے دور میں متعدد مسلم حکومتیں قائم ہوئیں، لیکن ان کو اسلامی انقلاب کی توسیع کا عمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ اسے مسلمانوں کی حکومتوں کا قیام قرار دیا جائے گا۔ یہ بات ایک سادہ سی مثال سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ خلافت راشدہ کے دوران جتنے ممالک بھی مسخّر و مفتوح ہوئے ان ممالک کی عظیم اکثریت نے اسلام قبول کر لیا۔ جبکہ ہسپانیہ اور ہندوستان میں

مسلمانوں کی حکومت قریباً ساڑھے سات سو سال تک قائم رہی، لیکن ان کی عظیم اکثریت غیر مسلم ہی رہی۔ جس کے نتیجہ میں ہسپانیہ کے سقوط کے بعد آج وہاں مسلمانوں کا نام ونشان بھی نہیں ملتا اسی طرح ہندوستان میں آزادی اور تقسیم ملک کے وقت مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بیس پچیس فیصد تھا۔ یہ مقامی لوگ بھی اکثر و بیشتر اولیاء اللہ اور صوفیائے کرام کی دعوت وتبلیغ سے مسلمان ہوئے تھے۔ حکومت نے اس کام سے نہ صرف غفلت برتی بلکہ جو لوگ مسلمان ہو گئے ان کی تعلیم وتربیت کا بھی کوئی معقول [illegible] انتظام نہیں کیا۔ ان غلطیوں کا خمیازہ ہے کہ آج [illegible] رہ جانے والی مسلم اقلیت بھگت رہی ہے۔

اسلام کا عالمی غلبہ

[illegible] چودہ سو سال بیت چکے ہیں اس عرصہ میں امت مسلمہ عروج و زوال کے مختلف ادوار سے گزری ہے[1] بہرحال خلافت راشدہ کے بعد اب تک جو عرصہ گزرا ہے اسے وقتی [illegible] تنزل کا مرحلہ کہیں گے۔ ہماری تقویم کے اعتبار سے اگرچہ یہ چودہ پندرہ سو سال [illegible] عرصہ نظر آتا ہے لیکن اللہ کے اپنے حساب کے مطابق اس عرصہ کی کوئی حیثیت ہی [illegible] بنتے ہیں۔ وہاں تو ایک دن ہزار برس کا ہوتا ہے[2] بہرکیف قرآن حکیم اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں ہمارا ایمان ہے کہ بالآخر وہ وقت آ کر رہے گا جب اسلام کا عالمی سطح پر غلبہ ہو گا انشاء اللہ العزیز۔ حق وباطل کی یہ کشمکش اور کشاکش فیصلہ کن درجہ تک پہنچے گی اور پورا کرہ ارضی نور توحید سے جگمگا اٹھے گا۔ اور کلمة الله هی العلیا کی شان کا پورے طور پر ظہور ہو گا۔

آیت نمبر ۴ کے بقیہ حصے کا مطالعہ

ان تمہیدی باتوں کے بعد ہم اب آیت نمبر ۴ کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ اس کا پہلا حصہ ہم پچھلی نشست میں قدرے تفصیل سے پڑھ چکے ہیں۔ تاہم ربط مضمون کے لئے چند

---

[1] اس موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ کا ایک نہایت اہم، مدلل اور فکر انگیز مقالہ "سرافگندیم" نامی کتاب میں شامل ہے۔ موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے اس کا مطالعہ نہایت مفید مطلب ہوگا (ادارہ)

[2] وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ (الحج : ۴۷)

باتوں کا اعادہ ضروری ہو گا۔ فرمایا فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ "پس جب تمہاری کافروں سے مڈبھیڑ ہو جائے تو (تمہارا پہلا کام ہے) خوب ان کی گردنیں مارنا' اس طرح مارنا جیسے مارنے کا حق ہے"۔ میں نے ترجمانی میں مڈبھیڑ ہو ہی جائے اس لئے کہا کہ اس سے پہلے باقاعدہ مسلح تصادم کا ایک جنگ کی صورت میں موقع نہیں آیا تھا۔ یہ موقع پہلی بار غزوہ بدر میں پیش آنے والا ہے۔ فَضَرْبَ الرِّقَابِ میں ضرب کے 'با' پر جو زبر ہے وہ مفعول مطلق کا فائدہ دے رہا ہے' اس سے قبل محذوف مانا جائے گا فَاضْرِبُوْا هُمْ ضَرْبَ الرِّقَابِ ماروان کو گردنوں کو مارنا۔ یہ قرآن مجید کی بلاغت و فصاحت کا اعجاز ہے کہ صرف ایک خاص اسلوب کے استعمال سے یہاں معانی و مفاہم میں وسعت پیدا کر دی۔ پچھلی مرتبہ میں اس پر تفصیل سے گفتگو کر چکا ہوں۔ یہ الفاظ بہت ہی سخت ہیں اور برا تیکھا انداز ہے لیکن یہ بات جان لیجئے کہ حق و باطل کی کشمکش میں اگر کوئی خاص فیصلہ کن مرحلہ آ جائے تو یہی انداز اس صورت حال کے عین مطابق ہے۔ جس سے اہل ایمان کو سابقہ پیش آئے گا۔ اس اسلوب میں ایک عجیب شان اور کیفیت جھلک رہی ہے جس سے صحیح لطف وہی اٹھا سکتے ہیں جو عربی ادب کے فہم کا ذوق رکھتے ہیں۔

اثخان

اب آگے چلئے فرمایا۔ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ یہاں تک کہ جب تم ان کی اچھی طرح خونریزی کر چکو پوری طرح کچل چکو' چور چور کر دو تب قیدیوں کو بڑی مضبوطی سے باندھو"۔ پچھلی مرتبہ میں نے نوٹ کرایا تھا کہ اثخان کا لفظ پورے قرآن مجید میں دو جگہ آیا ہے' ایک یہاں اور ایک سورہ الانفال میں۔ اثخان کا مفہوم و معنی بھی میں پچھلی دفعہ قدرے تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ اور یہاں ترجمہ میں بھی اس کے مطلب کی ادائیگی کو میں نے ملحوظ رکھا ہے بس یہ سمجھ لیجئے کہ اس کا صحیح و جامع مطلب یہ ہے کہ کسی کو اس طرح کچل دینا کہ اس میں مقابلہ کے لئے دوبارہ کھڑے ہونے کے کی سکت ہی نہ رہے گویا سانپ کا پھن اس طرح کچل دیا جائے کہ وہ اپنا سر پھر نہ اٹھا سکے۔

شدّ وثاق

پچھلے درس میں اس کی تشریح و توضیح بھی ہو چکی ہے اس میں اضافہ کر لیجئے کہ شدّ کے معنی جہاں زور اور مضبوطی کے آتے ہیں' وہاں باندھنے کے بھی آتے ہیں چنانچہ عرب میں جب

سفر پر جانے کے لئے سازو سامان باندھا جاتا ہے تو اسے شد الرحال کہتے ہیں۔ رحیلہ سفر کو کہا جاتا ہے تو انسان جب سفر کے لئے اپنی گٹھڑی باندھتا ہے تو یہ شد الرحال ہے۔ شد الرحال کا لفظ اس حدیث میں بھی آیا ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ کسی جگہ کی زیارت تبرّک کرنا اور ثواب کی نیت سے کسی جگہ کا سفر کرنا صرف تین جگہوں کے لئے جائز ہے۔ پہلی مسجد حرام یعنی بیت اللہ شریف دوسری ..... میری مسجد ..... اور تیسری مسجدِ اقصٰی۔ دنیا میں صرف ان تین مسجدوں کی زیارت کی نیت سے ایک مسلمان سفر کے لئے سامان باندھ سکتا ہے باقی رہے دوسرے مقامات! سفر کی ممانعت نہیں ہے۔ تجارت، سیرو سیاحت اور دوسرے دینوی کاموں کے لئے سفر کئے جا سکتے ہیں لیکن ان تین مساجد کے علاوہ کسی جگہ کو متبرک سمجھتے ہوئے اور اس کی زیارت کے لئے اور ثواب کی نیت سے وہاں کا سفر اس حدیث کی رُو سے درست نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر امام ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ جس پر ان کو چند نافہم لوگوں کے احتجاج پر قید کیا گیا اور اسی قید کی حالت میں وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

احسان اور فدیہ کا اصل محلّ

آگے چلئے فرمایا۔ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا میں نے جہاں تک غور کیا ہے تو میرے نزدیک آیت کے اس ٹکڑے میں تقدیم و تاخیر کا عمل ہوا ہے اور قرآن مجید میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ شاعری کا اسلوب عام نثر سے بالکل جدا ہوتا ہے۔ پھر اصناف سخن میں قریباً نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ ہوا کہ آزاد شاعری (BLANK VERSE) روشناس ہوئی ہے، جس میں قوافی و ردیف کا خیال نہیں رکھا جاتا لیکن اس میں غنائیت (RYTHM) موجود ہوتی ہے۔ اسی کو جدید شاعری بھی کہا جاتا ہے..... عرصہ ہوا کہ میں نے قرآن مجید کے اسلوب کے متعلق عرض کیا تھا کہ اس کا اسٹائل قطعی طور پر نہ عام نثر ہے اور نہ شاعری۔ بلکہ اس کے اسلوب کو ہم خطبہ کا اسلوب کہہ سکتے ہیں۔ گویا قرآن مجید خطبات الٰہی کا مجموعہ ہے۔ پھر اس کا اسلوب بڑی حد تک "BLANK VERSE" سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس آزاد شاعری میں غنائیت موجود ہوتی ہے لیکن اس میں عام طور پر فاعل، فعل، مفعول، خبر اور مبتدا وغیرہ میں تقدیم و تاخیر ہو جاتی ہے۔ میں نے بلا تشبیہ عرض کیا تھا کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں تقدیم و

تاخیر کا عمل ہوا ہے اس کا سبب قرآن مجید کا اپنا غنا ہے' اس کا جو ردم (RYTHM) ہے' اور اس کی جو ملکوتی موسیقی ہے۔ میری رائے میں اس غنائیت کی رعایت کی وجہ سے بعض مقامات پر تقدیم و تاخیر کا عمل ہوا ہے۔ اور یہاں بھی ہوا ہے۔ اصل میں جو بات سمجھائی گئی ہے اس کی ترتیب یہ ہے کہ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَاءً یعنی پہلے تو ان کافروں کی خوب گردنیں مارو اور اس وقت تک مارو جب تک ان کی طاقت کچلی نہیں جاتی۔ پھر ان کو مضبوطی سے باندھو' ان کو اسیر بناؤ..... اور یہ باندھنے کا عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک جنگ اپنے ہتھیار نہیں ڈال دیتی۔ یعنی فیصلہ کن حد تک مسلمانوں کے حق میں ختم نہیں ہو جاتی۔ WAR اور BATTLE کا فرق میں پچھلی تقریر میں اپنی امکانی حد تک خوب واضح کر چکا ہوں جنگ (WAR) ایک طویل عمل ہے جو کئی برسوں پر محیط ہو سکتا ہے۔ جبکہ BATTL یا معرکہ کسی وقتی جھڑپ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ باقاعدہ جنگ (WAR) کا آغاز تو غزوہ بدر سے ہوا لیکن غزوہ بدر پر جنگ ختم نہیں ہو گئی بلکہ معرکہ بدر ختم ہو گیا جنگ تو ابھی جاری تھی۔ مشرکین عرب کے ساتھ جنگ کا خاتمہ تو فتح مکہ پر جا کر ہوا۔ تو فرمایا کہ جب تک اس جنگ (WAR) کا سلسلہ ختم نہ ہو جائے اور ان دشمنان اسلام میں طاقت نہ رہے' حوصلہ نہ رہے کہ وہ مقابلہ میں کھڑے ہو سکیں یعنی جنگ اپنے ہتھیار رکھ نہ دے۔ تب تک انہیں مضبوطی سے باندھے رکھنا ہے۔ البتہ جب یہ شکل پیدا ہو جائے کہ اب جنگ کا معاملہ ختم ہوا۔ اہل ایمان کو فیصلہ کن فتح حاصل ہو چکی تو "اے مسلمانو! اب تم کو اختیار ہے کہ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَاءً چاہو تو ان کو بطور احسان رہا کر دو اور چاہو تو فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دو۔" یہ ہے تقدیم و تاخیر کا عمل جو اس آیت میں واقع ہوا ہے۔ اور یہ ہے اصل میں ترتیب جس کی عملی تفسیر و تشریح ہمیں سیرتِ مطہرہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ملتی ہے جو فتح مکہ کے بعد سامنے آتی ہے کہ حضورؐ نے تمام جباران قریش کو یہ فرمایا کہ آزاد کر دیا کہ "لا تثریب علیکم الیومَ" اور "اذھبوا فانتم الطلقاء" یہ موقع و محل ہے جہاں حضورؐ نے اپنی شان رافت و رحیمی کا بھی مظاہرہ فرمایا اور قرآن مجید کے حکم فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ پر بھی عمل کر کے دکھا دیا۔ اس کے بعد غزوہ حنین واقع ہوا۔ اس معرکہ میں جو چھ ہزار افراد بطور اسیران جنگ مسلمانوں کی تحویل میں آئے تھے جن کو مجاہدین میں بطور غلام تقسیم

ہونا ایک لحاظ سے طے شدہ امر تھا، حضورؐ کی حسن تدبیر سے دفعۃً وہ سب آزاد ہو گئے۔ لیکن یہ بات نوٹ کیجئے کہ اسیران حنین کو اس لئے رہا نہیں کیا گیا تھا کہ اب غلام بنانے کی حرمت کا حکم آ گیا تھا بلکہ یہاں سبب کچھ اور تھا۔ میں یہ تمام واقعات پچھلی تقریر میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔

مفکرین سنت کی کج فہمی

مفکرین سنت و حدیث نے فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً کو جو ایک مستقل و دائمی قانون بنا لیا کہ قتال فی سبیل اللہ کے نتیجہ میں جو قیدی ہاتھ آئیں، ان کے لئے دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کو بطور احسان چھوڑ دو یا فدیہ لے کر رہا کر دو۔ ان کے سوا تیسرا راستہ اور کوئی نہیں۔ یہ ان کی نافہمی یا کج فہمی ہے۔ یہاں تو اصلاً تین چیزیں بتائی گئی ہیں۔ کفار پہلے تو مستحق ہیں "فضرب الرقاب" کے یعنی ان کی گردنیں اڑا دی جائیں۔ یہ ان کی اصل سزا ہے، جس کے وہ مستحق ہو چکے ہیں دوسرا یہ کہ ان کو باندھو اور باندھنا بھی بڑی مضبوطی کے ساتھ ہے۔ اس باندھنے کی بھی تین شکلیں ہیں جن کو میں پچھلی نشست میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ اختصار کے ساتھ ان کو پھر بیان کر دیتا ہوں۔ باندھنے کی ایک شکل تو یہ ہے کہ انہیں اسیری ہی میں رکھا جائے۔ حضورؐ نے کچھ لوگوں کو اسیری میں رکھا ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ ان کو اسلامی معاشرہ میں جذب (ABSORB) کرنے کیلئے مجاہدین میں بطور غلام تقسیم کر دیا جائے..... اس غلامی کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایات دی ہیں اور ان کی آزادی کے لئے جو اخلاقی راہیں کھولی ہیں، وہ بھی سابقہ درس میں بیان ہو چکی ہیں۔ البتہ ایک صورت کا ذکر رہ گیا تھا کہ مکاتبت ہو جائے۔ یعنی غلام اور آقا میں معاہدہ ہو جائے کہ غلام اپنے طور پر محنت و مزدوری کر کے یا اگر اسے کوئی ہنر آتا ہے تو اس کے ذریعہ سے ایک مقررہ رقم آقا کو ادا کر دے گا تو آزاد ہو جائے گا۔ تیسری شکل یہ ہے کہ تمام لوگوں کو اسلامی حکومت کی اجتماعی غلامی میں سے لیا جائے۔ یہ اجتماعی غلامی کیا ہے! ان کو ذمی بنا لیا جائے۔ فرق یہ ہو گا کہ وہ حقوق میں مسلمانوں کے مساوی (EQUAL) نہیں ہوں گے بلکہ وہ اسلامی ریاست کے دوسرے درجہ کے شہری (SECOND RATE CITIZEN) ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان کے لئے "صاغر" کا لفظ آیا ہے۔ "حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ○" اس پر سابقہ نشست میں مفصل

گفتگو ہو چکی ہے ... یہ تین شکلیں ہیں " شدِ وثاق ' اب جو لوگ سنت رسولؐ کو یکسر نظر انداز کر دیں ' اس کی حجیت کے انکاری ہوں ' جو تاریخ کو بھی پس پشت ڈال دیں تو ان کے متعلق ہلکی سے ہلکی بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ یہ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی کور چشم ہیں۔ ان کو نہ تاریخ کا علم ہے اور نہ فلسفۂ تاریخ کا کوئی شعور ہے ۔ البتہ یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ بحالات موجودہ غلامی کا کوئی ادارہ (INSTITUTION) موجود نہیں ہے۔ چونکہ یہ معاملہ تو خالص اسلامی جہاد اور قتال سے متعلق ہے۔ یہ نہیں کہ کسی ملک کے لوگوں کو زبردستی پکڑ کر غلام بنا لیا جائے اور انہیں منڈیوں میں یا انفرادی طور پر بیچ دیا جائے۔ یہ بُردہ فروشی بہت بڑا جرم ہے۔ اسلام اسے کسی شکل میں جائز نہیں ٹھہراتا۔ یہ کام ہر فقہی مسلک کے نزدیک اسلام میں حرام مطلق ہے۔ جیسا کہ میں پچھلی تقریر میں بتا چکا ہوں کہ اس دور میں یہ جرم اہل یورپ نے بڑے پیمانے پر کیا کہ افریقہ کے آزاد لوگوں کو پکڑ کر لوہے کی بھاری زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑ کر امریکہ لے جاتے تھے اور انہیں اپنا غلام بنایا جاتا اور ان کی خرید و فروخت کی جس کے لئے ان کو حکومت اور قانون کی طرف سے پورا تحفظ حاصل تھا پس آزاد لوگوں کو پکڑ کر اس طرح غلام بنا لینا اسلام کے اعتبار سے بھی اور انسانیت کے اعتبار سے بھی نہایت گھناؤنا جرم ہے۔

بہر حال میں عرض کر رہا تھا کہ دراصل یہ معاملے کے تین پہلو ہیں جو اس آیت کے پہلے حصہ میں بیان ہوئے ہیں اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک ہی وقت میں سب کے لئے یہ مسئلے طے ہو جائیں۔ قریش کی حد تک فتح مکہ کے بعد ہی آخری درجہ میں بات پہنچ گئی تھی۔ دوسرے قبائل کے لئے بات دوسرے درجہ میں تھی اور باقی پوری دنیا کے لئے تو ابھی پہلا ہی درجہ تھا۔ ابھی ان کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں چھیڑ چھاڑ ہی شروع ہوئی ہے ان کے ساتھ باقاعدہ جنگ (WAR) کا آغاز تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ پہلے خلیفہ راشد کے دور میں ہوا ہے ... پھر یہ سلسلہ جاری رہے گا تاقیامِ قیامت ' جب تک پورے کرہ ارض پر اللہ کا دین غالب نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ " شُدُّوا الوِثَاق " کا حکم برقرار ہے ' یہ ختم نہیں ہوا۔ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِ مَّا فِدَاءً نے اس کو منسوخ نہیں کیا ہے بلکہ یہ اپنی جگہ قائم ہے ' دائم ہے اور جب بھی خالصتاً غلبۂ دین کے لئے قتال ہو گا تو تینوں شکلوں میں سے کوئی بھی اختیار کی جا سکے گی۔ یہ ہے قرآن کا اصل اور ابدی قانون یہی وجہ ہے کہ ہمیں غلامی کے ادارہ (INSTITUTION) کے خاتمہ کی صراحتہً نہ کنایتاً قرآن

مجید میں کوئی آیت نہیں ملتی۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کو کیا دیر لگتی تھی کہ جہاں چھ ہزار سے زائد آیات نازل فرمائیں وہاں ایک آیت یہ بھی نازل فرما دیتے کہ آج سے غلامی کا قانون ختم کیا جا رہا ہے۔ بات ختم ہو جاتی۔ اہل ایمان میں سے کوئی چُوں بھی نہ کرتا۔ نہ حضورؐ نے ہی غلامی کے ادارہ (INSTITUTION) کے خاتمہ کا اعلان فرمایا۔ بلکہ غزوہ حنین کے چھ ہزار اسیران جنگ جو مجاہدین میں تقسیم ہونے والے تھے' ھوازن اور ثقیف کے قبائل کی سفارت پر انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تدبیر بتائی اور پھر صحابہ کرامؓ کے مجمع میں اپنے خاندان کے حصہ کے قیدیوں کی آزادی کا اعلان فرما کر مجاہدین سے سفارش فرمائی کہ وہ بھی اپنے اپنے حصہ کے قیدیوں سے دستبردار ہو جائیں اور تمام مجاہدین خوشی خوشی دست بردار ہو گئے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حکم بھی دے سکتے تھے۔ لیکن چونکہ اللہ کا منشاء تدعا اور حکمت یہی تھی کہ غلامی کے ادارہ کو باقی رکھا جائے لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حکم نہیں دیا بلکہ سفارش تک معاملہ رکھا۔ اور اس سفارش کے نتیجہ میں چھ ہزار قیدی آزاد ہو گئے۔ لہٰذا قرآن کا درحقیقت سمجھنا وہ سمجھنا ہے جو سنت اور سیرت مطہرہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی روشنی میں سمجھا جائے۔ اس سے آزاد ہو کر کوئی شخص قرآن فہمی کا دعویٰ کرتا ہے وہ خود بھی گمراہ ہے اور جو لوگ اس کی بات کو تسلیم کر لیں اندیشہ یہ ہے کہ وہ بھی اپنی راہ گم کر بیٹھیں گے اہل سنّت کا مجمع علیہ موقف یہ ہے کہ سنت رسولؐ اور احادیث صحیحہ سے جو شخص اپنے آپ کو آزاد کر کے قرآن پر غور و فکر اور تدبر کرے گا وہ ٹھوکریں کھائے گا اور ضلالت میں مبتلا ہو کر رہے گا۔

آیت مبارکہ کے بقیہ حصہ کا مطالعہ

اب آگے چلئے فرمایا ذٰلِکَ یہاں جو ذٰلِکَ کا لفظ آیا ہے تو یہ ہے زور دینے کا انداز..... تاکید کی جا رہی ہے کہ یہ ہے اصل بات' یہ ہے تمہارے کرنے کا اصل کام۔ یعنی اس مقام سے سرسری طور پر نہ گزر جانا۔ اس کے ایک ایک لفظ پر ڈیرہ لگا کر بیٹھو۔

سنت الٰہی کی طرف اشارہ

آگے فرمایا۔ وَلَوْ یَشَآءُ اللّٰہُ لَانْتَصَرَ مِنْہُمْ "اور اگر اللہ چاہتا تو خود ہی ان مشرکین و کفار سے نمٹ لیتا"..... اب رسولوں کے بارے میں اللہ کی جو سنت رہی ہے' اس کے ضمن میں بات آ رہی ہے۔ اہل ایمان کو بتایا جا رہا ہے کہ جیسے ہمارا ہمیشہ سے قاعدہ رہا ہے

کہ جن قوموں کی طرف رسول بھیجا اور رسول نے اتمام حجت کر دیا۔ حق کو پہنچانے کا حق ادا کر دیا۔ پھر بھی قوم نے نہیں مانا تو قوم ہلاک کر دی گئی۔ اس ہلاکت کے طریقے پہلے کیا رہے! حضرت نوحؑ کی قوم پر ایک بہت عظیم سیلاب آیا پوری قوم غرق ہو گئی۔ حضرت ہود اور حضرت صالحؑ کی قوموں پر عذاب مختلف شکلوں میں آیا سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝ قوم عاد پر ایک تیز آندھی بھیجی گئی جو سات راتیں اور آٹھ دن ان پر مسلسل چلتی رہی۔ تصور کیجئے کہ تھوڑی دیر کے لئے تیز آندھی آتی ہے تو کیا دگرگوں حال ہو جاتا ہے اور اس آندھی میں توریت کے چھوٹے چھوٹے ذرات ہوتے ہیں' اگر ذرا بڑے کنکر آرہے ہوں تو وہ گولی کا کام کرتے ہیں۔ اگر سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل طوفانی آندھی آئے اور اس میں کنکر ہوں تو وہ کیا تباہی لائیں گے۔ اس طرح قوموں کو ہلاک کیا گیا کسی قوم پر زبردست زلزلہ آگیا کہیں بستیوں کو الٹ دیا گیا۔ عذاب کی یہ مختلف شکلیں رہی ہیں۔ لیکن یہ تمام عذاب آفات سماوی وارضی کے مظاہر کی صورت میں آتے رہے ہیں۔ یہ عذاب انسانوں کے ہاتھوں نہیں آئے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان مشرکین و کفار قریش و عرب سے خود ہی براہ راست نمٹ لیتا ہے۔ اے مسلمانو! تمہیں یہ تکلیف نہ دیتا کہ ہاتھ میں تلوار اٹھاؤ اور میدان قتال میں آؤ..... اللہ تعالیٰ آن واحد میں ان مشرکین و کفار کو تہس نہس کر سکتا تھا' ان سے انتقام لے سکتا تھا۔ اس لئے کہ وہ ہلاکت کے مستحق ہو چکے تھے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان پر اتمام حجت کر چکے ان پر احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہو چکا۔ لیکن ایسا کیوں نہیں ہوا! اس کی شرح آگے آرہی ہے۔

اہل ایمان کی آزمائش و امتحان

اللہ تعالیٰ نے ان مشرکین سے خود انتقام کیوں نہ لیا! اس لئے کہ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ لیکن یہ بھی اللہ کی حکمت ہے۔ تمہارے بازمیں اے اہل ایمان' اللہ تعالیٰ نے ایک خاص فیصلہ کر رکھا ہے۔ وہ یہ ہے کہ تم انسانوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ سے آزمائے۔ تمہارے ایمان کا بھی امتحان ہو گا اگر اللہ تعالیٰ کسی سماوی یا ارضی آفت کے ذریعہ سے ان سب کو دفعۃً ہلاک کر دیتا تو تمہارے صبر و مصابرت اور استقامت کا امتحان کیسے ہوتا! تمہاری تربیت کا ذریعہ کیا بنتا! تم جو قلیل تعداد اور اتنے کم ہتھیاروں کے

باوجود ہتھیلی پر جان رکھ کر میدان قتال میں آ گئے ہو تو تم نے ثابت کر دیا کہ تم مومن صادق ہو۔ اور جو جان بوجھ کر پیچھے رہ گئے' کونوں کھدروں میں چھپ گئے تو معلوم ہو گیا کہ وہ مدعی ایمان ہُوا کریں لیکن ان کے دلوں میں ایمان حقیقتہً نہیں ہے۔ وہ منافق ہیں۔ یہ تمیز کیسے ہوتی ہے۔ اگر یہ شکل نہ ہوتی! یہ ابتلاء کا فلسفہ ہے یہ آزمائش کی حکمت ہے۔ اس بات کو یوں بھی سمجھ لیجئے کہ قرآن مجید کہتا ہے کہ یہ دُنیوی زندگی ہے ہی آزمائش کے لئے خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً ..... علامہ اقبال مرحوم نے اغلباً اسی آیت کی تعبیر اس شعر میں کی ہے ؎

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحان ہے زندگی

ابتلاء کا وہی لفظ یہاں آیا لیبلوا بعضکم ببعض تاکہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے آزمائے..... اس نے مشرکین و کفار کو چھوٹ دی وہ قریباً بارہ برس تک مکہ میں محمدٌ رسولُ اللّٰہ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ کو ستاتے رہے اللہ تعالیٰ چاہتا تو ابوجہل کا ہاتھ شل کر دیتا اور وہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو شہید نہ کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو امیہ ابن خلف کو فالج زدہ کر دیتا اور وہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو کوئی گزند نہ پہنچا سکتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو اہل ایمان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے کی چھوٹ دیئے رکھی۔ کیوں! اس لئے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ صنف نازک ہونے کے باوجود حضرت سمیہ کے دل میں کتنا ایمان ہے! لوگوں کے سامنے یہ بات کیسے آتی کہ حضرت بلالؓ کے دل میں اللہ کی توحید پر کتنا پختہ یقین ہے! اور انؓ کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی محبت ہے! انؓ کے دل میں یوم آخرت پر کتنا ایمان ہے!۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھروں کی بارش کرنے کی آزادی اللہ نے اہل طائف کو دی تاکہ لوگوں کو علم ہو جائے کہ ہمارے رسول، صلی اللہ علیہ وسلم صبر و ثبات' استقامت' توکل علی اللہ میں کوہ ہمالیہ سے بھی بلند و بالا شخصیت ہیں۔ فداہ امی وابی۔ یہ ہے بعض کو بعض کے ذریعہ سے آزمانا۔ یہ ہے وہ نظام جس کے ذریعہ تربیت مقصود ہے۔ یہ جانچ پرکھ کا وہ نظام ہے جو ازل سے اللہ کی حکمت بالغہ نے تمہارے لئے طے کر رکھا ہے..... تمہیں تو ابھی آزمائش کی بھٹیوں سے گذار کر کندن بنانا ہے تمہیں تو اسلام کے عالمی غلبہ تک سفر کرنا ہے۔ اب وہ معاملہ نہیں ہو گا کہ آفات ارضی و

(باقی ص۶۳ پر)

مؤلف: ڈاکٹر محمد رفیع الدین
مترجم: ڈاکٹر ابصار احمد

منشورِ اسلام

(۷)

نماز زبانی تکرار نہیں، بلکہ ذہنی عمل کا نام ہے

ذکر ایک ذہنی عمل ہے نہ کہ صرف الفاظ کا تکرار اعادہ۔ ذکر کی اصل روح تفکر و تدبر کی وہ داخلی کیفیت ہے جو حسن ازلی کے ساتھ تعلق کی استواری سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ کیفیت بلا استثناء تسبیح و تحمید، عجز و انکساری، خوف و رجا اور مسرت و اطمینان کے جذبات عالیہ کے ساتھ وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اور یہ جذبات یکے بعد دیگرے محب کے ذہن میں محبوب حقیقی کے ساتھ اس کے وقتی رجحان اور تعلق کی مناسبت سے آتے جاتے ہیں۔ الفاظ کا زبان سے بار بار ادا کرنا صرف اس لیے ہے تاکہ یہ عاشق کی اس کیفیت کے حصول میں مدد دے اور یہ مدد اس طرح ہوتی ہے کہ یہ الفاظ حسن ازلی کی ان صفات پر ارتکاز توجہ کا باعث بنتے ہیں جن کا اظہار ان سے ہوتا ہے۔ اگر نماز یا عبادت کا بدنی عمل اس داخلی ذہنی سعی کے ساتھ نہ ہو تو وہ جذبات محبت و عبودیت میں بالیدگی کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اگر نماز یا ذکر کا عمل مندرجہ بالا جذبات کے ساتھ ہے تو یہ اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ داخلی کوشش موجود ہے اور محب کا علم و عرفان ترقی پذیر ہے۔ قرآن مجید مندرجہ ذیل آیات میں اسی حقیقت کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۖ وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ ۝ (الانبیاء: ۹۰)

ترجمہ: "اور وہ امید و بیم کے ساتھ ہمیں پکارتے تھے اور ہمارے آگے (عجز و نیاز سے) جھکے رہتے تھے"

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝
(المومنون: ۱-۲)

ترجمہ: "یقیناً (وہ) ایمان لانے والے فلاح پا گئے جو اپنی نماز میں خشوع رکھنے والے ہیں۔"

اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ط (الاعراف: ۵۵)

ترجمہ: "اپنے رب کو پکارو، گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔"

وَادْعُوهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ط اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ

(الاعراف: ۵۶)

ترجمہ: "اور اُسی کو پکارو (اُس کے عذاب سے) ڈرتے ہوئے اور (اس کی رحمت سے) اُمید رکھتے ہوئے۔ بے شک اللہ کی رحمت نیکوکاروں سے قریب ہے۔"

خدا سے واقعی محبّت رکھنے والا فرد ہمیشہ خوف اور رجا کے بین بین رہتا ہے اس کو خوف اس بات کا رہتا ہے کہ مبادا وہ جذبۂ محبّت سے تہی دامن ہو کر اپنے محبوب کی ناراضگی مول نہ لے لے۔ اور امید و رجا اس بات کی ہوتی ہے کہ اس کی محبّت و سپردگی اسے اپنے محبوب کی نظروں سے پہلے سے زیادہ بلند کرے گی۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلْاِيْمَانُ بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ۔

ترجمہ: ایمان خوف اور اُمید کے درمیان پایا جاتا ہے۔

عبادت گزار کا سب سے بڑا انعام اس کے جذبۂ محبّت اور نتیجتاً اس کی شخصیّت کا کامل ارتقاء ہے

جب محبّتِ خداوندی خلوص اور نکھار کا اعلیٰ ترین مرتبہ حاصل کر لیتی ہے تو اس وقت محبّ محبوب کی ناراضگی سے فی نفسہٖ خائف رہتا ہے۔ اس کا یہ خوف اس سزا یا عقوبت کے ڈر سے نہیں ہوتا جو اس طور واقع ہو سکتی ہے۔ اس کے نزدیک محبوب کی ناراضگی سے بڑی سزا ناقابلِ تصوّر ہے۔ اسی طرح وہ محبوب کی پسند اور رضا کا فی نفسہٖ طلبگار ہوتا ہے نہ اس لیے کہ یہ کسی دوسرے انعام کا باعث بنتا ہے۔ اس کے نزدیک محبوبِ حقیقی کی پسند اور رضا سے زیادہ بڑا کوئی

انعام نہیں ہے۔ ازروئے قرآن اللہ تعالیٰ کی رضا وہ سب سے بڑا انعام ہوگا جو کسی صاحبِ ایمان کو جنّت میں داخل ہوتے ہوئے حاصل ہوگا۔

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (التوبہ: ۷۲)

ترجمہ: "اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انہیں حاصل ہوگی یہی بڑی کامیابی ہے۔"

یہ انعام اتنا خوش کن اور لذّت آگیں ہوگا کہ اس کی کیفیّت یا کمیت کا کوئی ہلکا سا اندازہ بھی اس دنیا میں نہیں لگایا جاسکتا۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَاۗءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (السجدۃ: ۱۷)

ترجمہ: تو کسی متنفس کو علم نہیں کہ کیسا کیسا آنکھوں کی ٹھنڈک (کا سامان) ان کے لیے (خزانۂ غیب میں) مخفی ہے۔ یہ ہے صلہ ان کے (نیک) اعمال کا۔

اس متوقع انعام کی نوید جانفزا اُسے جنّت الفردوس کے دروازے پر ہی سنادی جائیگی۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ۝ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۝ (الفجر: ۲۷-۳۰)

"اے نفسِ مطمئن چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تُو اُس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنّت میں۔"

عبادت کے زندہ عمل کے ساتھ عبدیّت، عجز و انکساری اور نفی ذات کے جذبات اس لیے ہوتے ہیں کہ انسانی خودی اپنے خالق اور معبود کے قریب سے قریب تر ہونا چاہتی ہے اور یہی صورتِ حال حسنِ لازوال پر تدبّر و تفکّر میں ہوتی ہے۔ یہ جذبات و احساسات محبّ کے شعورِ ذات اور اثباتِ خودی کے ساتھ متصادم نہیں ہوتے۔ بلکہ درحقیقت یہ انہیں مزید تقویت پہنچاتے ہیں کیونکہ ذاتِ حقیقی کے ساتھ قرب و اتّصال اس میں ایک بے مثال قوّت اور برتری کا احساس اجاگر کرتا ہے۔ محبوب کے حسن اور قدرت کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو جتنا ہیچ اور کم تر خیال کرتا ہے اور جیسے جیسے وہ محبوبِ حقیقی کی صفاتِ حسن و قدرت کا عرفان زیادہ سے زیادہ حاصل کرتا ہے، وہ خود اپنی عظمت سے آگہی حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔

چنانچہ اس طور محبوب کی صفاتِ حسنہ سے وہ خود حصہ پاتا ہے اور اپنی شخصیت میں ان کا انجذاب کرتا ہے۔

باجماعت نماز پنجگانہ (صلوٰۃ)

صاحب ایمان لوگوں کا باقاعدہ نظم کے تحت اور اپنے میں سب سے افضل شخص کو امام بنا کر اس کی اقتدا میں پانچ وقت نماز ادا کرنا اقامتِ صلوٰۃ کہلاتا ہے۔ اور یہ ذکر کی سب سے اچھی شکل ہے۔ نماز میں ذکر کی وہ ممکنہ اور کم سے کم مقدار آجاتی ہے جس کی ایک صاحب ایمان کے ذوق محبت کے اظہار اور اس کی بالیدگی کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے نہ صرف ذکر کی عادت مستحکم بنیادوں پر قائم ہوتی ہے، بلکہ اس سے اس کے ذوق محبت کو بھی وقفوں کے ساتھ تقویت پہنچتی ہے جو اس کے مستقبل میں افزونی کا باعث بنتی ہے۔ نماز کا مقام صاحب ایمان لوگوں کی جمعیت میں انتہائی اہمیت کا ہے۔ یہ ان کی پوری عملی زندگی کے لیے محور کا کام کرتی ہے اور ذکر سے معمور زندگی کا عملی نقشہ پیش کرتی ہے۔ تاہم صرف فرض نماز ایک مومن کے ذوق محبت کی بالیدگی اور اس کی بلند ترین سطح حاصل کرنے کے لیے کافی نہیں ہے اور اس سے اس سطح پر مطلوب ذکر کی مقدار پوری نہیں ہوتی۔ اور ظاہر ہے کہ روحِ انسانی کا مطمع نظر ترقی کی یہی چوٹی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سچے مومن کو فرض نمازوں کے علاوہ بھی اپنی روحانی ترقی اور ترفع کے لیے ذکر کے اہتمام کی تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

"پھر جب نماز ہو چکے تو (تم کو اختیار ہے کہ) زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ (البقرۃ: ۲۰۰)

"پھر جب تم اپنے حج کے ارکان پورے کر چکو تو جس طرح تم اپنے باپ دادوں کے

ذکر میں لگ جاتے تھے اس طرح اب اللہ کا ذکر کرو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر:

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ۔

(آل عمران: ۱۹۰)

"جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔"

حسنِ ازل کے ساتھ رشتۂ محبت ایک عجیب لذت، انبساط اور اطمینان کا باعث بنتا ہے اور جوں جوں ذوقِ محبت ذکر و فکر کے ساتھ بڑھتا ہے یہ انبساط و اطمینان بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور یہ نہ صرف یہ کہ کسی صاحبِ ایمان کے یقین میں اضافے کا باعث بنتا ہے، بلکہ اس کی حیثیت ایک گہرے ذاتی تجربے کی ہوتی ہے۔ یہ ذاتی تجربہ اس کو اپنے ہدف کا علم اور اس کی درستگی کا پتہ بھی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ صاحبِ ایمان کے لیے امید اور اعتماد کی ایک بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اور مقصدِ اعلیٰ کے حصول میں کوشش کو ابھارتا اور منضبط کرتا ہے بفحوائے آیتِ قرآنیہ:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ (الرعد: ۲۸)

"ایسے ہی لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور اُن کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہوتے ہیں۔ یاد رکھو، اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔"

ذکر سے جو غیر معمولی اور مخصوص اطمینان ایک شخص کو حاصل ہوتا ہے وہ بجائے خود اس امر کا ثبوت ہے کہ ذکر فطرتِ انسانی کی اہم ترین ضرورت اور داعیے کو پورا کرتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ فطرت کا نظام ہی کچھ ایسا ہے کہ ہر فطری خواہش خواہ اس کا تعلق حیاتیاتی سطح سے ہو یا نفسیاتی سطح سے، جب پوری ہوتی ہے تو اس کے نتیجے کے طور پر آسودگی اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور اسی خوشی اور آسودگی سے اس خواہش یا داعیے کی تکمیل کی جہت کا تعین ہوتا ہے۔

اخلاقی کردار۔ خارجی عمل میں حُسن کا اظہار

صحیح نصب العین جس خارجی عمل کو ابھارتا ہے، وہ صفاتِ حُسن کا اپنے تئیں اور دوسروں

کے ساتھ برتاؤ میں اظہار پر مشتمل ہوتا ہے۔ عام طور پر اسے اخلاقی عمل کا نام دیا جاتا ہے مگر نصب العین کی طرح صحیح مذہبی نصب العین کا بھی ایک اپنا اخلاقی قانون ہوتا ہے جو فرد کے ہر عمل کی نوعیت اور قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے۔ چونکہ یہ قانون صفاتِ حسن سے اپنا جواز فراہم کرتے ہیں، چنانچہ جو فرد بھی ان قوانین کی پابندی کرتا ہے اس کا عمل بھی صفاتِ عالیہ کا مظہر ہوتا ہے۔ یہ امر مسلّم ہے کہ جو شخص کسی نصب العین کو اپناتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے وہ اپنی محبّت کا اظہار ہر ممکن عمل میں کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو کوئی صحیح دینی نصب العین سے محبّت کرتا ہے وہ اس کا اظہار نہ صرف حسنِ لازوال پر ارتکازِ توجہ سے کرتا ہے بلکہ اپنا پورا عمل بھی اسی کے مطابق کر لیتا ہے۔ اس کے شب و روز اور اس کا پورا کردار و عمل اس کے عین مطابق ہو جاتے ہیں:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَاشَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ (الانعام: ۱۶۳، ۱۶۴)

"کہو، میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ ربّ العٰلمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سرِ اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔"

محبّتِ حسن اور اخلاقی عمل کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا

اگر ایک مدعیٔ ایمان اپنے عمل میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ کا اظہار نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے خالقِ حقیقی کی صفات اور حسن کا کوئی ادراک حاصل نہیں کیا اور نہ ہی اُسے اس سے محبّت ہے۔ کیونکہ یہ ناقابلِ تصوّر ہے کہ ایک شخص اللہ کی صفاتِ حسنہ مثلاً حسن، انصاف، حق، خیر، محبّت وغیرہ سے متاثّر ہو لیکن اپنے عمل میں ان کا اظہار قطعاً نہ کرے یعنی وہ انصاف کی بجائے ظلم، محبّت کی بجائے نفرت و تشدّد اور حق کی بجائے باطل کا اظہار کرے۔ اگر وہ اپنے دعویٰ محبّت میں سچا اور مخلص ہے تو تمام اندرونی اور بیرونی مشکلات

اور موانع کے علی الرغم اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ کے سانچے میں اپنے عمل کو ڈھالنے کی حتی المقدور کوشش کرتا ہے۔ اور اس سعی و جہد میں وہ صفاتِ حسنہ کے شعور کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرتا، اپنے ذوقِ محبّت کو بڑھاتا اور خود آگہی کی بلند تر منزل حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ ذوقِ محبّت کا جب تک عمل سے تعلق رہتا ہے اُس کی شدّت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور جونہی وہ عمل سے جدا ہو کر شعوری سطح سے نیچے گرتا ہے، اس کی شدّت میں کمزوری واقع ہو جاتی ہے۔

جو شخص ایک بار نیک اور راست عمل کرتا ہے، اس کا دوبارہ کرنا اُس کے لیے نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ ایک ایسا شخص جس میں ظلم و تعدی عادتاً موجود ہو جب ایک بار شعوری طور پر مشفق و کریم ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ تو یہی عمل بار بار کرنے پر اس کے لیے آسان سے آسان تر ہو جاتا ہے۔ اِس کی وجہ اُس کے ذوقِ محبّت کی صحیح رُخ میں نشوونما ہے۔ ایک غلط عمل کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ایک بار صراطِ مستقیم سے انحراف کر کے جب ایک شخص غلط کام کا ارتکاب کرتا ہے تو اُس کے لیے صراطِ مستقیم پر مراجعت مشکل تر ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کے ذوقِ محبّت میں کمی اور اضمحلال واقع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ ہماری خود آگہی اور ذوقِ محبّت کا ارتقار کاملۃً ہمارے اعمال کی اخلاقی نوعیّت پر منحصر ہے۔ ایک ایسا فرد جو حسنِ ازل کی پہچان کے بعد اس سے تعلّق کا اظہار صرف ذکر و فکر کی شکل میں کرتا ہے لیکن اپنے روزمرہ کے افعال و اعمال میں اس کا اظہار نہیں کرتا۔ خود آگہی اور عرفانِ ذات کے اعلیٰ مدارج حاصل نہیں کر سکتا۔ بلکہ احتمال اس بات کا بھی ہے کہ اس کا ذوقِ محبّت کم ہو جائے کیونکہ صرف گیان دھیان سے وہ اسے جتنا مستحکم کرتا ہے، اپنی بے عملی کے نتیجے میں وہ اُسے اس سے زیادہ کمزور کر دیتا ہے اور یہ طرزِ عمل یقینی طور پر گھاٹے کا سودا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص صبح کے وقت دو گھنٹے اپنے ہدف کی طرف صحیح راستے پر چلے۔ لیکن دن کا باقی حصّہ بالکل مخالف سمت میں چلتا رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص کبھی بھی اپنی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتا بلکہ اس سے دُور ہی ہٹتا چلا جائے گا۔

اخلاقی عمل کیونکر رفتہ رفتہ آسان تر ہو جاتا ہے

جب کوئی محبّ صحیح نصب العین سے محبّت کرنا شروع کرتا ہے تو آغاز میں اُس کا جذبۂ محبّت کمزور ہوتا ہے چنانچہ اس نصب العین کے اخلاقی قانون کی پیروی میں بھی کوتاہی اور نقص رہ جاتا ہے۔ مکمل اور ہر نقص سے پاک پیروی ارتقاءِ خودی کی بلند سطح پر ہی ممکن ہے۔ جب تک محبّ یا سالک اُس منزل تک نہیں پہنچ جاتا۔ انتہائی کوشش کے باوجود وہ اکثر غلطیوں اور خامیوں کا مرتکب ہوتا رہتا ہے۔ لیکن جب نماز اور دوسرے اذکار کا باقاعدہ اہتمام کر کے وہ حسنِ لازوال سے اپنا رشتۂ محبّت مضبوط کر لیتا ہے اور اپنے نفس کے اندھے داعیات پر کنٹرول حاصل کر لیتا ہے تو اس کے لیے جملہ اخلاقی قوانین پر کاربند ہونا آسان تر ہو جاتا ہے۔ اس کا عمل خامیوں سے مبرّا اور اخلاقی اعتبار سے اعلیٰ تر ہوتا چلا جاتا ہے اور حسنِ مطلق کی صفاتِ حمیدہ سے اُس کی ہم آہنگی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس سطح پر اخلاقی عمل حسن پر ارتکازِ توجہ مزید ممکن بنا کر فرد کو اعلیٰ تر سطح کی خود شعوری اور ادراکِ ذات بہم پہنچاتا ہے۔ حسنِ مطلق کی زیادہ بہتر معرفت اور معیّت پا کر جب ایک صاحبِ ایمان اپنے مشغولاتِ ذکر و فکر کی طرف لوٹتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اب ان میں پہلے سے کہیں زیادہ ارتکازِ توجہ کر سکتا ہے اور اس طرح وہ ان سے اطمینان و انبساط بھی زیادہ حاصل کرتا ہے۔ حسنِ مطلق کا یہ مراقبہ اس کے جذبۂ عشق کو مہمیز دیتا ہے اور زندگی کے شب و روز میں اخلاقی قانون کی بجا آوری کو سہل بنا دیتا ہے۔ اس طرح مراقبہ (یعنی ذکر و فکر) اور اخلاقی عمل باہم دگر لازم و ملزوم ہیں اور دونوں مل کر فرد کو ادراکِ ذات کے اعلیٰ تر مقام پر لے جاتے ہیں، حتیٰ کہ وہ ارتقاءِ جذبۂ حُبّ کی اعلیٰ ترین منزل تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ چنانچہ امر واقعہ یہ ہے کہ جذبۂ محبّت کی اگر مناسب آبیاری کی جائے اور اس کے تقاضوں کو مسلسل کما حقہٗ پورا کیا جائے تو اس میں ضرور اضافہ ہوتا ہے اور اس کی شدّت و قوت دو چند ہو جاتی ہے۔ بفحوائے آیاتِ قرآنیہ: وَيَزِيدُ اللّٰهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى ط

(مریم : ۷۶)

ترجمہ: جو لوگ راہ راست پر ہیں اللہ ان کو (روز بروز) زیادہ ہدایت دیتا چلا جاتا ہے۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ

(العنکبوت : ٦٩)

ترجمہ : اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ضرور انہیں اپنے راستے دکھائیں گے۔

إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى ٥

(الکھف : ١٣)

ترجمہ : وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔

گناہ کی حقیقت

(ا) اسبابِ گناہ : ایک مسلمان سے لغزش یا غلطی کا صدور صرف اس وقت ہوتا ہے جب وقتی طور پر اس کا ذوقِ حسن صحیح نصب العین سے مخالف سمت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور یہ اسی وقت ہوتا ہے جب کوئی خیالِ فاسد اسے اپنی جانب متوجہ کر کے جذبۂ محبت کی غلط سمت میں راہنمائی کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ عمل صحیح نصب العین کی بجائے کسی باطل نصب العین کی مقصد برآری کرتا ہے۔ چنانچہ ایک غلطی یا سیاہ کاری دوسری غلطیوں کے لیے راہ ہموار کر دیتی ہے۔ کوئی باطل یا فاسد خیال ایک ضعیف الاعتقاد شخص کے دل میں یہ یقین پیدا کر دیتا ہے کہ اگر وہ اس کام کو انجام دے لے تو اسے مسرت حاصل ہو گی یا کسی عارضی رنج و الم سے چھٹکارا ہو جائے گا۔ حالانکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس عمل کے تقاضے اس کے حسنِ مطلق کے ساتھ رشتۂ محبت کے تقاضوں اور مطالبوں کے خلاف اور متضاد ہیں چنانچہ اصل مسئلہ اس کی اپنی خودی اور اس کے استحکام کا ہے۔ اگر اس میں پختگی نہیں ہے تو وہ حقیقی محبوب اور اس کی محبت کو پسِ پشت ڈال کر اس عارضی آرام یا مسرت کو ترجیح دے دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ اس لمحے کے لیے حقیقی ایمان اور محبتِ الٰہی سے تہی دامن ہو جاتا ہے اور اس سے غلط اعمال کا صدور ہوتا ہے۔

(ب) گناہ کا خودی پر اثر : جب باطل خیال اور اس کے زیر اثر باطل عمل وقوع پذیر ہو جاتا ہے اور اس کی عارضی لذت ختم ہو جاتی ہے تو ایک صحیح الاعتقاد مسلمان اس لغزش و نسیان کے بعد دوبارہ اپنے محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی یہ محبت کمزور پڑ گئی ہے اور شیطانی افعال و خیالات کے ساتھ اس کا رشتہ مضبوط ہو رہا ہے۔ فطرت کا اٹل قانون ہے کہ جیسے خیالات ذہن انسانی میں گھر کیے رہیں گے اور جس قسم کے افعال کا ظہور اس کے اعضاء و جوارح سے ہوگا، ان کا ایک گہرا تاثر اس کے قلب و ذہن پر پڑے گا۔ یہ حقیقت نیک افعال کے بارے میں بھی اتنی درست ہے جتنی افعال شنیعہ کے بارے میں۔ چنانچہ امر واقعہ یہ ہے کہ کوئی فعل خواہ وہ کتنا ہی حقیر ہو، انسانی خودی کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور اس کی تعمیر یا تخریب کا کام کرتا ہے۔

گناہ سے بچنے کا طریقہ

ایک غلط خیال پہلے پہل انسان کی قوت متخیلہ پر اثر انداز ہوتا ہے اور بعد ازاں اس کے قوائے عمل پر گرفت حاصل کرتا ہے۔ جونہی یہ ذہن میں داخل ہوتا ہے اسی لمحے وہ اس محبت پر نقب زنی کرتا ہے جو صحیح نصب العین کے لیے مختص ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ خیال اتنا قوی ہو جاتا ہے کہ وہ انسان سے عمل بد کروانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہونا یہ چاہیے کہ خیال فاسد کو ذہن میں آنے کے بعد فوراً ہی دبا دیا جائے۔ کیونکہ دیر تک غلط سوچ کا ذہن پر مستولی ہونے کا نتیجہ عمل بد کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ غلط سوچ اور فکر ہی ہمیشہ غلط کام کا پیش خیمہ ہوتا ہے جس کو شیطانی وسوسے کے تحت کچھ وقت کے لیے ذہن میں گل کھیلنے کا موقع دے دیا جاتا ہے۔ اگر فکر بد کو تخیل کی سطح پر فوری طور پر ختم نہ کیا جائے یہ لازماً عمل بد پر منتج ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک مومن صادق کے خیال میں جونہی کوئی شیطانی وسوسہ آتا ہے وہ فوراً متوجہ ہو کر شعوری طور پر اسے اپنے ذہن و قلب سے نکال باہر کرتا ہے کیونکہ وہ ایک پل بھر کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول نہیں لینا چاہتا۔ ان مومنین صادقین کی یہ شان قرآن کریم نے اس طرح بیان کی ہے :

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝ (الاعراف: ۲۰۱)

ترجمہ: حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں، اُن کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے ڑسے کوئی بُرا خیال اگر انہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں۔ اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے (کہ ان کے لیے صحیح طریق کار کیا ہے)

غلط خواہش نفس سے بچنے کا نقد فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبّت بڑھ جاتی ہے اور وہ اس دنیا میں بھی خوف وحزن سے محفوظ رہتا ہے اور آخرت میں جنّتِ نعیم کا حقدار بنتا ہے۔ جب تک انسان کے ذہن وقلب کے کسی گوشے میں باطل نظریے کے ساتھ تعلق کا کوئی شائبہ پایا جاتا ہے، خواہ اس نے ابھی عمل اس باطل نظریے کے مطابق نہ کیا ہو، وہ حقیقی معنوں میں مومن صادق اور محبِ صادق نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث نبویؐ میں آیا ہے، اس میں ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں رہتا۔

گناہ انسان کی فطرتِ سلیم کے خلاف عمل ہے جو انسانی خودی کے ارتقاء اور ترفّع کے عمل میں منفی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ انسان کے باطن کی قلبِ ماہیت کر کے اس کی ترقّی کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر دیتا ہے۔ اس کو ہٹائے بغیر کوئی مسلمان روحانی ترفّع حاصل نہیں کر سکتا۔

گناہ کے بُرے عواقب سے بچنے کا طریقہ تطہیرِ نفس

گناہ کے بُرے عواقب اور اثرات سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان معصیت کے ارتکاب کے فوراً بعد خود احتسابی کرے اور یہ دیکھے کہ وہ کون سی ذہنی کیفیت اور حالت تھی جس کی وجہ سے معصیت کا ارتکاب ہوا۔ اسے اس بات کی از حد پشیمانی ہونی چاہیے کہ وہ جن نفسانی خواہشات کا غلام بن گیا تھا وہ انتہائی گھناؤنی اور قابلِ مذمّت تھیں۔ جتنی گہری یہ پشیمانی ہوگی اتنا ہی اس بات کا امکان کم ہوگا کہ وہ دوبارہ اس گناہ کو دہرائے۔ اس مقصد کے لیے یہ بھی ازبس ضروری ہے کہ وہ حسنِ ازلی پر دوبارہ بھرپور طریقے پر ارتکاز توجہ کرے تاکہ اس تعلق قلبی میں جو کمی واقع ہو گئی تھی وہ پوری ہو جائے۔ جونہی وہ معصیت اور اس کے غلط اثرات کو

اپنے ذہن وقلب سے دھوتیا ہے۔ پھر انابت الی اللہ کے مراحل طے کرنے لگتا ہے۔ یہ تطہیری عمل جس کے ذریعے ایک عاصی انسان اپنے نفس کو پاک کرتا ہے "توبہ" یا رجوع الی اللہ کہلاتا ہے بطور ذہنی عمل رجوع یا توبہ کے چار اجزا ہیں :

۱۔ غلطی اور معصیت کا اعتراف یعنی یہ احساس کہ جو کچھ اس نے چاہا یا کیا وہ انتہائی قبیح تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے تہہ دل سے اپنے کیے پر ندامت اور پشیمانی ہونا ضروری ہے۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا
عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ط (التوبة : ۱۰۲)

ترجمہ: "اور کچھ دوسرے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کر لیا ہے۔ ان کا عمل مخلوط ہے۔ کچھ نیک ہے اور کچھ بد۔"

۲۔ خیال اور عمل دونوں کی سطح پر اس معصیت کو انجام نہ دینے کا عزم مصمّم:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ط (التحریم: ۸)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے حضور میں توبہ کرو، خالص توبہ۔"

۳۔ معرفتِ الٰہی اور حبِّ الٰہی کو دوبارہ حاصل کرنے کی بھرپور کوشش اور اس کے لیے اخلاقی اصلاح کی حتی المقدور سعی۔

فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (الانعام : ۴۸)

"پھر جو کوئی ایمان لایا اور اس نے (اپنے طرزِ عمل کی) اصلاح کر لی تو ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔"

۴۔ خالقِ حقیقی کی صفاتِ حسنہ پر تجدیدِ ایمان اور اس حقیقت کا یقین کہ اس کا مربّی اور اس کی خودی کو بالیدگی اور نشوونما دینے والا سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی اور نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اسی تعٰلے سے عفو و درگزر کا خواستگار ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اسی کی خوشنودی اور رضا کے ساتھ حقیقی روحانی ترفّع حاصل کر سکتا ہے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ

يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (النساء : ۱۱۰)

ترجمہ: اور جو شخص کوئی بُرا کام کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ سے مغفرت طلب کرے تو وہ اللہ کو بڑا مغفرت والا (اور) بڑا رحم کرنے والا پائے گا۔

توبہ کے محولا بالا ذہنی لوازم اُس وقت بطریق احسن پورے ہوتے ہیں جب ایک بندۂ عاصی تہہ دل سے قرآن میں سکھائی گئی یہ دعائیں پڑھتا ہے اور ان کے ایک ایک لفظ کا گہرا شعور حاصل کرتا ہے:

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (الاعراف : ۲۳)

"اے رب ہمارے! ہم نے اپنی جانوں پر بڑا ظلم کیا اور اگر تُو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم خسارہ پانے والوں میں ہو جائیں گے۔"

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الانبیاء: ۸۷)

"(خدایا!) تیرے سوا کوئی معبود نہیں، پاک ہے تیری ذات بے شک میں ہی قصوروار ہوں۔"

نفس اور روح کی مکمل تطہیر اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک انسان اُن تمام خواہشات، تمناؤں اور افعال سے اجتناب نہیں کرتا جو اس کی فطرت سلیمہ کے خلاف ہیں اور ہر طرف سے منہ موڑ کر اس حسن ازلی کی طرف رُخ نہیں کر لیتا جس کی عبادت و محبت کی خواہش اس کے وجود کی گہرائیوں سے پھوٹ رہی ہے۔

وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝ (المزمل: ۸)

ترجمہ: اور سب سے کٹ کر اُسی کے ہو رہو۔

معصیت پر تہہ دل سے ندامت و پشیمانی اور خدا کے حضور گریہ و آہ و زاری کے ذریعے ایک سیاہ کار اپنے رب کے بے پایاں فضل سے اس قابل ہوتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے ساتھ اپنا ٹوٹا ہوا ایمانی رشتہ دوبارہ استوار کر سکے۔ اور اسی طرح اس کی خودی دوبارہ مستحکم ہو کر شیطانی وسوسوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ مناجات اور آنسوؤں کے ساتھ خدا کے حضور دعائیں مانگنے کے لیے رات کا آخری حصہ بالخصوص مفید ہے۔ کیونکہ اس وقت دن کی مشغولیات سے توجہ نہیں بٹتی اور انسان

پورے اطمینان خشوع وخضوع اور حضوری قلب کے ساتھ اپنے رب کے سامنے گڑگڑا سکتا ہے

يَآاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ (المزمل: ۱-۴)

"اے کپڑے میں لپٹنے والے رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم۔ آدھی رات یا اس سے کچھ کم کرلو، یا اس سے کچھ زیادہ بڑھادو، اور قرآن کو خوب ٹھیر ٹھیر کر پڑھو۔"

(بخاری شریف)

بقیہ: مولانا آزاد اور وحدتِ دین

"حتی کہ اب معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ ایک طرف مسلمانوں کی معاشرتی و اجتماعی زندگی مختل ہو رہی ہے کیوں کہ اس کی تمام ضرورتوں کے مطابق احکام فقہ نہیں ملتے اور شریعت کو فقہ کے مذاہب (فقہ اربعہ) میں منحصر سمجھ لیا گیا ہے...... دوسری طرف اسلامی حکومتوں نے قوانین شرع پر عمل درآمد ترک کر دیا ہے اور اس کی جگہ یورپ کے دیوانی اور فوجداری قوانین اختیار کرنے لگے ہیں کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ دفاتر فقہ وقت کے انتظامی و معاشرتی مقتضیات کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اور کوئی نہیں جو انہیں بتلائے کہ اللہ کی شریعت کا دامن اس نقص سے پاک ہے اور وہ کتاب و سنت کی طرف رجوع کرتے تو انہیں اس زمانہ کے لئے ایسے ہی اصلح و اوفق قوانین مل جاتے۔ جس طرح پچھلے عہدوں کے لئے مل چکے ہیں (ترجمان دوم صفحہ ۱۲۶)

تکمیل شریعت پر اتنی جامعیت اور اہمیت کے ساتھ روشنی ڈالنے والا کیا دوسرے مذاہب کو اور اسلام کو ایک سطح پر رکھ سکتا ہے؟

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

(۷)

حکمتِ اقبال

اقبال کے اذکار حکمتِ مغرب سے ماخوذ نہیں

بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اقبال نے اپنے تصورات حکمائے مغرب سے مستعار لیے ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کی نگاہ میں اقبال پر لکھنے یا ریسرچ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اقبال کے ماخذ کو حکمتِ مغرب میں تلاش کیا جائے اور اسے وہ ایک نہایت ہی ضروری اور بڑا عظیم الشان کام سمجھتے ہیں جو لوگوں کو اقبال پر کرنا چاہیئے۔ دراصل یہ لوگ مادی علوم میں مغرب کے تفوق سے مرعوب ہو کر یہ سمجھتے ہیں کہ ان انسانی علوم میں بھی جس کو اقبال نے اپنے غور وفکر کا موضوع بنایا ہے، کہاں کوئی مشرق کا آدمی مغرب سے الگ راہیں پیدا کر سکتا ہے۔ حالانکہ حکمائے مغرب کو خود اعتراف ہے کہ وہ انسانی علوم میں کوئی ترقی نہیں کر سکے یہ لوگ اس بات کو نظرانداز کر جاتے ہیں کہ تمام حکیمانہ افکار کسی نہ کسی تصورِ حقیقت کے اجزا و عناصر ہوتے ہیں۔ اس کی تشریح اور تفسیر کرتے ہیں اور اس کے اردگرد ایک نظامِ حکمت بناتے ہیں اقبال کا تصورِ حقیقت اسلام کا خدا ہے جس کے لیے وہ خودیٔ عالم کی فلسفیانہ اصطلاح کام میں لاتا ہے اور مغرب میں ایک بھی فلسفی ایسا نہیں جس کا تصورِ حقیقت اسلام کا خدا ہو لہٰذا ممکن ہی نہیں کہ کسی مغربی حکیم کا کوئی تصور اپنی اصلی حالت میں اقبال کے کام آسکے اس میں شک نہیں کہ خودی (SELF) کی فلسفیانہ اصطلاح بعض حکمائے مغرب نے بھی استعمال کی ہے لیکن ان میں کسی کے ہاں اس اصطلاح کے معنی وہ نہیں لیے گئے جو اقبال نے لیے ہیں اور جس کے منطقی یا عقلی مضمرات یا نتائج اسلام کے خدا کی صفات کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوں اگر اقبال کے فلسفہ کا مرکزی تصور یعنی تصورِ خودی اس کا اپنا تصور ہے جو کسی اور فلسفی کے ہاں موجود نہیں تو پھر ضروری ہے

کہ اقبال کے اس مرکزی تصور کے مضمرات و تضمنات بھی اس کے اپنے تصورات ہوں اگرچہ ان میں سے بعض ایسے ہوں جو کچھ مغربی فلسفیوں کے تصورات سے مشابہت رکھتے ہوں اور بظاہر ان سے ماخوذ نظر آتے ہوں۔

ظاہر ہے کہ ایک فلسفی جب اپنے تصورِ حقیقت کی تشریح یا ترجمانی کرے گا اور اس کے نتائج اور مضمرات پر بحث کرے گا تو اس غرض کے لیے ان تمام حقائق کو کام میں لائے گا جو اس کی تعلیم و تربیت اور مطالعہ اور مشاہدہ نے اس کے دائرہ علم میں داخل کر رکھے ہوں گے لیکن یہ حقائق اس کے تصورِ حقیقت کے رشتہ میں منسلک ہوتے وقت اس تصور کے رنگ میں اس طرح رنگے جائیں گے کہ وہ عقلی اور منطقی طور پر اسی کے مضمرات بن جائیں گے۔ اقبال کے معلوم حقائق اسے اپنے تصورِ حقیقت کے نتائج کے استخراج اور استنباط میں اس کی مدد دیتے ہیں اس کے لیے ایک اکساہٹ کا کام دیتے ہیں اس کی توجہ کو ضروری سمتوں کی طرف مبذول کرتے ہیں لیکن خود اپنی اصلی حالت میں اس کے تصورِ حقیقت کے نتائج نہیں بن سکتے بظاہر نظر آئے گا کہ وہ ان حقائق کو پوری طرح سے استعمال کر رہا ہے لیکن درحقیقت وہ ان کو صرف اسی حد تک استعمال کرتا ہے جس حد تک کہ وہ اس کے تصورِ حقیقت کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اور اس کی تشریح اور تفسیر کا درجہ اختیار کر سکتے ہیں کہا جاتا ہے کہ اقبال کا تصورِ ارتقا برگسان سے اس کا تصورِ خودی فشٹے اور نیٹشے سے اس کا تصورِ وجدان جیمز وارڈ سے اور اس کا تصورِ ریاست ہیگل سے ماخوذ ہے لیکن درحقیقت ظاہری مشابہت کے باوجود اقبال کے یہ تصورات ان فلسفیوں کے متوازی تصورات سے یکسر مختلف ہیں اور اقبال اور مغرب پر لکھنے والوں کے لیے بڑا عظیم الشان کام دراصل یہی ہے کہ کس طرح سے اقبال کے تصورات ان فلسفیوں کے تصورات سے مختلف ہیں اور ان سے زیادہ معقول اور مدلل ہی نہیں بلکہ صحت اور درستی کے تمام معیاروں پر پورا اترتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال نے پورے غور و فکر کے ساتھ مغربی فلسفہ کا مطالعہ کیا ہے یہاں تک کہ اقبال اس کی رگ رگ سے باخبر ہو گیا ہے اور وہ اس کے آب و گل میں سرایت کر گیا ہے۔

ہے فلسفہ مرے آب و گل میں　　　پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

اقبال اگرچہ بے ہنر ہے
اس کی رگ رگ سے باخبر ہے

لیکن مغربی فلسفہ نے اقبال پر کوئی اثر نہیں کیا ہے۔ وہ فلسفۂ مغرب کے غلط تصورات کا مخالف ہے۔ اس فلسفہ کے متعلق وہ کہتا ہے۔

انجام خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفۂ زندگی سے دوری
گر اپنی خودی اگر نہ کھوتا!
زناریٔ برگساں نہ ہوتا!
ہیگل کا صدف گہر سے خالی
ہے اس کا طلسم سب خیالی

حکمائے مغرب کے تصورات سے متاثر اور مرعوب ہونا تو درکنار اقبال ان تصورات کو اپنے وجدان حقیقت کی روشنی میں پرکھتا ہے اور جانتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کہاں تک درست اور کہاں تک غلط۔ جس حد تک کوئی تصور درست ہوتا ہے وہ اسے اپنے حکیمانہ موقف کی تشریح اور تفسیر کے لیے کام میں لاتا ہے اور جس حد تک وہ غلط ہوتا ہے وہ اسے نظر انداز کرتا ہے بلکہ اس کے خلاف تنبیہہ کرتا ہے۔ حکمت مغرب کا طلسم اس پر کام نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ حکمت مغرب میں دانہ بھی ہے اور دام بھی اور وہ دانہ کو لے لیتا ہے اور دام کو توڑ ڈالتا ہے۔ اس طرح سے حکمت مغرب کی آگ اس کے لیے گلزارِ ابراہیم بن جاتی ہے۔

طلسمِ عصرِ حاضر را شکستم
ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانندِ براہیم
بنارِ او چہ بے پروا نشستم

فلسفۂ خودی کی آسان اور مختصر تشریح کا مطالبہ دُرست نہیں

پھر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی تشریح کو آسان اور مختصر ہونا چاہیے لیکن یہ مطالبہ جو دراصل فلسفۂ خودی کی نوعیت کو نظر انداز کرنے سے پیدا ہوتا ہے درست نہیں فلسفۂ خودی کوئی قصہ یا داستان نہیں کہ ہم چاہیں تو اسے مختصر بھی کر سکیں اور آسان بھی یہ مطالبہ ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی شخص کہہ دے کہ علم طب کو یا طبیعات کو یا حیاتیات کو یا نفسیات کو آسان اور مختصر ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ان علوم میں سے کوئی بھی اپنی قدرتی حدود سے زیادہ نہ آسان ہو سکتا ہے اور نہ مختصر۔ ان میں سے ہر ایک اشیاء کے اوصاف و خواص کا علم ہے اور اشیاء کے اوصاف و خواص تو وہی ہو سکتے ہیں جو قدرت نے ان کو دیئے ہیں۔ ہم ان کو تعداد میں کم نہیں کر سکتے لہٰذا ان کے علم کو آسان یا مختصر کیسے بنا سکتے ہیں۔ فلسفۂ خودی بھی روح انسانی کے اوصاف و خواص کا علم ہے چونکہ روح انسانی کے اوصاف و خواص وہی ہیں جو قدرت نے اسے دیئے ہیں لہٰذا ہم روح انسانی کے علم کو بھی اس کی قدرتی حدود سے زیادہ آسان یا مختصر نہیں بنا سکتے۔ اگر ہم ریاضیات یا طبیعات کے علم میں سے بی اے یا بی اے کے اوپر کے معیار کے مسائل یا حقائق کو حذف کر کے صرف انٹرمیڈیٹ کے معیار کی ایک کتاب لکھ دیں تو ہمارا یہ دعویٰ غلط ہوگا کہ ہم نے ریاضیات یا طبیعات کو آسان اور مختصر کر دیا ہے۔ درآنحالیکہ دوسروں نے اسے خواہ مخواہ طویل اور مشکل بنا دیا تھا اور پھر علم کے متعلق انسان کا قدرتی اور صحیح مطالبہ یہ نہیں کہ وہ مختصر ہو بلکہ یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ وسیع اور مفصل ہو۔ انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ علم کو برابر وسعت دیتا رہے اور اس غرض کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہ کرے اور کسی خطرے کو زیادہ نہ سمجھے علمی ریسرچ جس پر کروڑوں روپیہ دنیا بھر میں صرف ہو رہا ہے اور ہزاروں فضلا اور حکماء کام کر رہے ہیں انسان کی فطرت کے اسی پہلو کو مطمئن کرتا ہے اور پھر روح انسانی کے اوصاف و خواص کا علم تو تمام علوم سے زیادہ ضروری اور مفید ہے بلکہ یہ علم تو انسان کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اس کے بغیر اس وقت انسانیت ہلاکت کے دروازے پر کھڑی ہے کیا ایسے مطالبے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کے متعلق کم جاننے اور زیادہ تر تاریکی میں رہے تاکہ اس کے اعمال میں

راہ دانی کا عنصر کم ہو اور بے راہ روی کا عنصر زیادہ ہو جس طرح سے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے جسمانی اعمال اور وظائف کو زیادہ سے زیادہ سمجھیں تاکہ جسمانی بیماریوں کے عوامل اور معالجات کو زیادہ سے زیادہ جانیں اور صحت اور تندرستی سے زندگی بسر کر سکیں اسی طرح سے ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی خودی کے اعمال اور وظائف کو زیادہ سے زیادہ سمجھیں تاکہ خودی کی بیماریوں کے عوامل اور معالجات کو زیادہ سے زیادہ جانیں اور اپنی ساری زندگی کو خوشگوار بنا سکیں دورِ حاضر میں انسانی سوسائٹی کی تمام خرابیوں اور بدحالیوں کا جن میں جنگ، مفلسی، بداخلاقی، بے اطمینانی، ظلم اور تشدد شامل ہیں، اور انسانی علوم کے اندرونی انتشار اور بے ربطی کا باعث خودی کے علم کی کمی ہے۔ ہر علم ترقی کرتا ہے یہ علم کی ایک خصوصیت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف سے انسان کا علم پیاسا ہے اور دوسری طرف سے اشیاء کے خواص و اوصاف کے علم کی کوئی حد نہیں اور پھر علم جب وسیع ہو گا اور ترقی کرے گا تو اسی نسبت سے اس کو حاصل کرنا بھی مشکل ہوتا جائے گا تو پھر کیا ایک علم ایسا ہونا چاہیے جسے ہم بے تکلف آسان اور مختصر رکھیں اور وہ علم بھی جوہرِ انسانی کا علم ہو جو سب سے زیادہ ضروری ہے ہم اپنے کسی عزیز کو جو پھیپھڑے کی بیماری میں مبتلا ہو کسی ایسے ڈاکٹر کے پاس نہیں لے جا سکتے جس کا علم انسانی پھیپھڑوں کے متعلق آج سے پچاس سال پہلے کی تحقیقات تک محدود ہو یا جس کے متعلق ہمیں معلوم ہو کہ پھیپھڑوں کے متعلق جو علم انسان کو آج تک حاصل ہو سکا ہے وہ اس کا نصف ہی جانتا ہے تو پھر جوہرِ انسانی کے متعلق محدود واقفیت کی خواہش کرنے میں کون سی حکمت ہے ہاں یہ درست ہے کہ خودی کا علم تو زیادہ سے زیادہ مبسوط اور مفصّل بنایا جائے لیکن مبتدیوں کے لیے آسان اور مختصر کتابیں بھی ہوں پھر جو لوگ علمِ خودی کے ماہرین بننا چاہیں وہ ایسی کتابوں کا مطالعہ کریں جو علمِ خودی کی ان انتہائی تفصیلات پر مشتمل ہوں جو آج تک انسان کے دائرہ علم میں آ چکی ہیں تاکہ وہ ان تفصیلات کی گہرائیوں میں اور جائیں اور ان میں اضافہ کریں اور اس طرح سے خودی کا علم ترقی کرتا رہے اور پھر اس بات پر بھی غور فرمائیے کہ مشکل اور آسان کے اوصاف محض اضافی ہیں جو علم ایک شخص کے لیے مشکل ہے وہ دوسرے کے لیے آسان ہو جاتا ہے جو اسے محنت سے حاصل کرتا ہے۔ مشکل علوم میں سے کون سا علم ایسا ہے جس کے ماہرین ضروری تعداد میں موجود نہ ہوں اگر علم حاصل

کرنے کی خواہش نہ ہو تو کوئی علم آسان نہیں ہوتا۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ آسان ہے لیکن خود عربی دانوں میں ایسے لوگوں کی تعداد کم نہ ہوگی جن کے لیے بغیر کوشش اور محنت کے قرآن کا سمجھنا مشکل ہے دراصل قرآن کے اس دعویٰ کی بنیاد یہ ہے کہ قرآن صداقت ہے اور صداقت چونکہ پہلے ہی انسان کے دل کے اندر موجود ہوتی ہے لہٰذا جو شخص اپنے آپ کو یا اپنے دل کو جانتا ہو اس کے لیے اس کا سمجھنا اور باور کرنا آسان ہوتا ہے۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ

(بلکہ وہ روشن یعنی واضح اور قابل فہم آیات ہیں جو پہلے ہی ان لوگوں کے دلوں میں موجود ہیں جن کو اپنے آپ کا علم دیا گیا ہے)

فلسفہ خودی بھی چونکہ سچا فلسفہ ہے اور انسان کا دل اس کے نکات کی صحت کی شہادت دیتا ہے لہٰذا وہ آسان ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مطالعہ یا کوشش یا محنت کے بغیر سمجھ میں آسکتا ہے قدرت کا قانون ہے کہ انسان کوشش کے بغیر کوئی چھوٹی یا بڑی کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔

لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى

(انسان وہی کچھ حاصل کرسکتا ہے جس کے لیے کوشش کرے۔

کیا اقبال پر مزید لکھنے کا دور ختم ہو چکا ہے

پھر بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اقبال پر لکھنے کا زمانہ اب ختم ہو گیا ہے کیونکہ اس پر جو کچھ لکھا جاسکتا تھا لکھا جا چکا ہے اقبال کی تحریروں کو اور نچوڑنے سے کیا نکلے گا۔ آخر اقبال پر کہاں تک کوئی لکھ سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ بھی فلسفہ خودی کی نوعیت پر اور اس کی توسیع اور تنظیم کی ممکنات پر اور ان تصورات کی کمیت اور کیفیت پر غور نہیں کرتے جو اس میں مضمر ہیں۔ اقبال نے خودی پر لکھا ہے لہٰذا اقبال پر لکھنے کے معنی یہ ہیں کہ اقبال کے افکار کی روشنی میں خودی کے موضوع پر لکھا جائے اور خودی کے موضوع کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ خودی حقیقت کائنات ہے۔ ساری کائنات خودی کا کرشمہ

ہے اور کائنات کی ہر چیز کا باعث خودی ہے۔

پیکرِ ہستی زِ آثارِ خودی است
ہر چہ مے بینی زِ اسرارِ خودی است

لہٰذا جو کچھ آج تک مادی کائنات میں یا حیوانات کی دنیا میں یا انسانوں کی دنیا میں ہوتا رہا ہے یا آئندہ ہوگا وہ خودی کے اعمال و افعال اور تصرفات و اثرات کا ہی نتیجہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام قوانین قدرت خودی کے اوصاف و خواص کے مظاہر ہیں سارا علم خودی کا علم ہے خودی کا تصور علم کی ابتدا اور انتہا ہے اور حال اور مستقبل کے تمام حقائق علمی تصورِ خودی کے مضمرات ہیں اور اس کے اندر بالقوہ موجود ہیں۔ لہٰذا جوں جوں علم اپنے تینوں شعبوں میں یعنی مادہ، حیوان اور انسان کے شعبوں میں ترقی کرے گا تصورِ خودی کی تشریح کا نت نیا سامان پیدا ہوتا رہے گا اور ظاہر ہے کہ یہ عمل تا قیامت جاری رہے گا۔ اقبال پر لکھنے کا پہلا اہم قدم یہ ہے کہ ہم اقبال کے افکار کو ایک منطقی یا عقلی سلسلہ کی شکل دے کر یہ بتائیں کہ کس طرح سے طبیعات، حیاتیات اور نفسیات کے تمام سچے حقائق جو آج تک دریافت ہو سکے ہیں، تصورِ خودی کے اجزاء و عناصر ہیں۔ یہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی پہلی تشریح اور تفسیر ہو گی جسے فلسفۂ خودی کے ماہرین ہی نہیں بلکہ تمام تعلیم یافتہ لوگ بھی آسانی سے سمجھ سکیں گے جب اقبال کی اس قسم کی تشریح وجود میں آئے گی تو اس وقت صاف طور پر نظر آجائے گا کہ اقبال کے کئی تصورات دورِ حاضر کے تمام انسانی اور نفسیاتی علوم یعنی عمومی فلسفۂ انسان و کائنات، فلسفۂ سیاست، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ تعلیم، فلسفۂ قانون، فلسفۂ اقتصادیات، فلسفۂ تاریخ، فلسفۂ ہنر، فلسفۂ نفسیات انفرادی و اجتماعی فلسفۂ علم وغیرہ کے ساتھ کئی نقطوں پر ٹکرائے ہیں۔ لہٰذا ان علوم میں سے کسی پر قلم اٹھانے والا اقبال کے ان تصورات کی تردید یا توثیق کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکے گا اور اقبال کے تصورات کی بنیاد اس قدر مضبوط ہے اور وہ تصورات اس قدر صحیح ہیں کہ رفتہ رفتہ یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان کی معقول تردید ممکن نہیں اور ان کی توثیق کے بغیر چارہ نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال پر لکھنے کا دوسرا اہم قدم یہ ہوگا کہ تصورِ خودی کے بنیادوں پر ان تمام علوم کی تدوین اور تعمیر نئے سرے سے کی جائے گی جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور ان علوم کی تعمیرِ نو کے سلسلہ میں بتایا جائے گا کہ کس طرح سے ان علوم

کی موجودہ تدوین عقلی اور علمی نقطۂ نظر سے غلط ہے اور اس طرح سے ان تمام علوم کو فلسفۂ خودی کی شاخوں کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ گویا اقبال پر نکھار اس زمانہ میں بھی اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم انسانی۔ حیاتیاتی اور طبیعاتی علوم کو نئے سرے سے اس طرح مدوّن نہ کر لیں کہ تصورِ خودی ان علوم کی رُوح کے طور پر نظر آنے لگے پھر اس ابتدائی کام کے بعد جُوں جُوں علم ترقی کرتا جائے گا فلسفۂ خودی کی مزید تشریح اور توسیع ہوتی رہے گی۔

جاری ہے

oooooooo

منہجِ انقلابِ نبویؐ

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے رہنما خطوط

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لیکر

مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل اور اسکی بین الاقوامی توسیع تک

اسلامی انقلاب کے مراحل مدارج اور لوازم

پر مشتمل

ماہنامہ "میثاق" میں شائع شدہ

امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کے دس خطبات کا مجموعہ

قیمت: -/۲۵ روپے صفحات: ۳۴۴ (نیوز پرنٹ)

ملنے کا پتہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶ ماڈل ٹاؤن لاہور

نقطۂ نظر

مولانا آزاد اور وحدتِ دین

مولانا اخلاق حسین قاسمی - دہلی

سورہ فاتحہ کی تفسیر پر تیسرا اعتراض یہ کیا گیا کہ مولانا آزاد نے دنیا کے تمام مذاہب کو ایک سطح پر رکھ کر اسلام کی منفرد صداقت کے عقیدہ کو ختم کر دیا اور قرآن مجید سے برہمو سماج اور گاندھی جی کے نظریہ کی تائید پیش کر دی'

مولانا آزاد کی یہ تفسیر اس دور میں سامنے آئی جب سیاسی اختلافات کے لئے اسلام کو استعمال کیا جا رہا تھا اور ہندو مسلمان' دونوں قوموں کو عقیدہ اور معاشرت کے ایک ایک جزء میں ایک دوسرے سے الگ ثابت کرنے کی سرتوڑ کوشش کی جارہی تھی۔

مولانا آزاد تفریق و علیحدگی کے اس سیاسی نظریہ کو کندم کر رہے تھے اس لئے جب سورہ فاتحہ میں مولانا نے وحدت دین کے تصوّر کی تشریح کی تو علیحدگی پسندوں میں کہرام مچ گیا اور مولانا کی تفسیر کے خلاف سیاسی اور مذہبی فتوے لگائے جانے لگے۔ حالانکہ مولانا آزاد اصولِ دین..... توحید' نبوت' آخرت اور نیک عملی..... میں وحدت کا تصور پیش کرنے والے پہلے مصنف نہیں تھے۔

مولانا آزاد نے سورہ فاتحہ میں اھد نا الصراط المستقیم ..... کی تشریح کے تحت وحدت دین کے مشہور مسئلہ کو بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔

مولانا آزاد ولی اللّٰہی فکر کے ترجمان و شارح ہیں۔ شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ جلد اوّل صفحہ (۸۶) میں یہ عنوان قائم کیا..... باب بیان ان الاصل الدین واحد والشرائع والمناھج مختلفۃ۔ اس امر کا بیان کہ اصل دین ایک ہے اور شریعتیں اور راستے مختلف ہیں..... اور اس باب میں قرآن کی چار آیتوں سے استدلال کیا۔

الشوریٰ ۱۳' المومنون ۵۳' المائدہ ۴۸' الحج ۶۷..... اور یہ بحث بڑی جامعیّت کے ساتھ ایک صفحہ پر ختم کر دی' جبکہ مولانا آزاد نے (۵۲) صفحات پر (۲۳) قرآنی آیتوں سے استدلال کر کے وحدت دین کے ولی اللّٰہی تصوّر کو مکمل اور منظم صورت میں پیش کیا۔

شاہ ولی اللہؒ کے بعد شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر صاحب نے جو [illegible] امام التفسیر کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں اور جنہیں فہم قرآن کی الہامی بصیرت کا حامل تسلیم کیا جاتا ہے، اپنے تفسیری فوائد (موضح قرآن) میں مختلف آیات کے تحت اس بنیادی تصور کی وضاحت کی۔

سورہ البقرہ آیت (۲۱۳) پر تفسیری فائدہ یہ لکھا۔

یعنی اللہ نے کتابیں اور نبی متعدد بھیجے اس واسطے نہیں کہ ہر فرقہ کو جدا راہ فرمائے اللہ کے ہاں سب خلق کو ایک ہی راہ کا حکم ہے، جس وقت اس راہ سے کسی طرف نکلے ہیں اللہ نے نبی بھیجا کہ سمجھادے اور کتاب بھیجی کہ اس پر چلے جاویں۔ پھر کتاب والے کتاب میں نکلے تب دوسری کتاب کی حاجت ہوئی، سب نبی اور سب کتابیں اسی ایک راہ کے قائم کرنے آئے ہیں..... اس کی مثال جیسے تندرستی ایک ہے اور مرض بے شمار جب ایک مرض پیدا ہوا ایک دوا اور پرہیز اس کے موافق فرمایا اب آخری کتاب میں ایسی راہ فرمائی کہ ہر مرض سے بچاؤ ہے۔ یہ سب کے بدلے کفایت ہوئی۔ ..... سورہ شوریٰ آیت (۱۳) کے فائدہ میں لکھا۔

اصل دین ہمیشہ ایک ہے اس کو قائم کرنے کے طریقے ہر وقت میں جدا ٹھہرائے ہیں اللہ نے۔

سورہ الحج آیت (۶۷) کے فائدہ میں لکھا۔

یعنی اصل دین ہمیشہ سے ایک ہے اور احکام ہر دین میں جدا آتے ہیں۔

سورہ الروم آیت (۳۰) کے فائدہ میں لکھا۔

یعنی اللہ سب کا حاکم، مالک سب سے نرالا، کوئی اس کے برابر نہیں، کسی کا اس پر زور نہیں..... یہ باتیں سب جانتے ہیں، اس پر چلنا چاہئے۔

ایسے ہی کسی کی جان مال کو ستانا، ناموس میں عیب لگانا، ہر کوئی برا جانتا ہے۔

ایسے ہی اللہ کو یاد کرنا، غریب پر ترس کھانا، حق پورا دینا، دغا نہ کرنا ہر کوئی اچھا جانتا ہے..... اس پر چلنا وہی دین سچا ہے۔

ان چیزوں کا بندوبست پیغمبروں کی زبان سے اللہ نے سکھلایا۔

شرع اور منہاج کے قرآنی الفاظ کی تعبیر شاہ ولی اللہؒ نے صور ھذا الامور ..... (نیک اعمال کی صورتیں) کے الفاظ سے کی ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب نے احکام کا لفظ لکھا ہے اور مولانا آزاد نے رسوم و ظواہر کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

وحدت دین کے تصوّر پر سرسید نے شاہ ولیؒ کی تحقیق کو دوہرایا، (حیات جاوید) مولانا آزادؒ کے

رفیق مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرت النبی جلد چہارم (صفحہ ۵۹۵) پر اس تصور کی وضاحت کی اور پاکستان سے شائع ہونے والے ایک کتابچہ "رسول وحدت" میں سید صاحب نے اس مسئلہ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی 'اور لکھا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب وعجم 'شام وہند 'پورب پچھم 'اتر دکھن 'کی تخصیص کو دور کرتے ہوئے بتایا کہ ہر ایک ملک وقوم میں خدا کا نور دیکھا گیا اور اس کی آواز سنی گئی اس لئے بلاتفریق و امتیاز دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں خدا کا رسول صادق اور راست باز تسلیم کرنا چاہئے۔

سید صاحب نے اس تقریر میں تین اصولی عقائد پر روشنی ڈالی ہے' (۱) وحدت الٰہ 'خدا کی توحید (۲) وحدتِ رسالت 'ہر قوم میں رسول آئے (۳) وحدتِ کتاب 'ہر قوم میں آسمانی ہدایت آئی..... وحدت کتاب کے عنوان میں لکھتے ہیں'

اس عنوان سے وحدتِ ادیان کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے جو اسلام کی وسیع اور بلند ذہنیت کو دنیا کے سامنے رکھتا ہے۔

اسلام سے پہلے دوسرے مذاہب نے اس جانب توجہ نہیں کی تھی..... لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو رواداری 'بے تعصبی اور نقطہ نظر کی وسعت اس مسئلہ میں ظاہر فرمائی وہ اسلام بلکہ دنیا کی مہتم بالشان تعلیمات میں سے ہے۔

آسمانی کتابیں اگرچہ غیر محدود ہیں تاہم تخصیص کے ساتھ جن کتابوں کے نام قرآن مجید میں آئے ہیں وہ چار ہیں۔

تورات 'انجیل 'زبور 'قرآن..... ان کے علاوہ ایک جگہ حضرت ابراہیم کے صحیفوں کا ذکر آیا ہے لیکن ان کے نام نہیں بتائے گئے۔

اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ۝ صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰی ۝ (الاعلیٰ ۱۹) "یہ تعلیم اگلے صحیفوں میں موجود ہے ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں"

اس لئے ایسی اگلی کتابوں کو جن میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں پائی جاتی ہوں گو ان کا ذکر قرآن میں نہ ہو جھوٹا نہ کہیں کیونکہ ان کا بھی خدا کی کتاب ہونا ممکن ہے۔ اگرچہ قطعیت کے ساتھ ان کا فیصلہ اس لئے نہیں ہو سکتا کہ قرآن نے ان کے نام نہیں بتائے (صفحہ ۱۵)

اس موقعہ پر ایک نکتہ بیان کرنے کے قابل ہے کہ قرآن مجید نے ہمارے سامنے دو لفظ پیش کئے ہیں..... دین اور شریعت..... شرع کو منسک و منہاج بھی کہتے ہیں۔

دین سے مراد مذہب کے وہ بنیادی امور ہیں جن پر تمام مذاہب حقہ کا اتفاق ہے مثلاً خدا کی ہستی' اس کی توحید' اس کی صفات کاملہ' انبیاء کی بعثت' خدا کی خالص عبادت' حقوق انسانی' اچھے اور برے اخلاق' اعمال کی جزاء و سزاء' یہ وہ اصل دین ہے جس میں تمام پیغمبروں کی تعلیمات یکساں تھیں۔

دوسری چیز یعنی شرع و منہاج اور منسک وہ جزئیات احکام ہیں جو ہر قوم و مذہب کی زمانی اور مکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتے رہے ہیں مثلاً عبادتِ الٰہی کے طریقوں میں ہر مذہب میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہے' عبادت کی سمتیں الگ الگ ہیں' اعمالِ فاسد کے انسداد کی تدبیریں جدا جدا ہیں۔

دنیا میں انبیاء علیہم السلام کا وقتاً فوقتاً ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا ہے کہ وہ اسی ازلی اور ابدی صداقت کو دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں اور دین کو اصل مرکز پر قائم رکھیں اور ساتھ ہی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے حالات کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جو ان کے لئے مناسب ہوں ان کو بتائیں اور سکھائیں (۱۷)

آخری کتاب

مگر قرآن اس دعوے کے ساتھ اترا ہے کہ اب اس کے بعد کسی دوسری آسمانی کتاب کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ ہمیشہ کے لئے' تحریف و تبدیل سے محفوظ کر دی گئی ہے اور اس کی حفاظت کا وعدہ خود خدا نے کیا ہے اور یہ وہ وعدہ ہے جو دنیا کی کسی آسمانی کتاب کے لئے خدا نے نہیں کیا' اس سے معلوم ہوا کہ وہ دنیا کی آخری کتاب ہے اور اس کا رسول دنیا کا آخری رسول ہے اب جو کچھ فیض دنیا کو پہنچے گا اسی کے ذریعہ پہنچے گا (۱۸) ..... (شائع کنندہ بیگم عائشہ باوانی وقف پوسٹ بکس نمبر ۴۱۷۸ کراچی نمبر ۲)

آخر دور کے مفسر مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اس مسئلہ پر یہ لکھا۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (انبیاء ۹۲) اے انسانو! تم سب حقیقت میں ایک ہی امت اور ایک ہی ملت تھے' دنیا میں جتنے نبی آئے وہ سب ایک ہی دین لے کر آئے تھے' اور وہ اصل دین یہ تھا کہ صرف ایک اللہ ہی انسان کا رب ہے ..... یہ خیال کرنا کہ فلاں نبی فلاں مذہب کا بانی تھا اور فلاں نبی نے فلاں مذہب کی بنیاد ڈالی اور انسانیت میں یہ حلقوں اور مذہبوں کا تفرقہ انبیاء کا ڈالا ہوا ہے محض ایک غلط خیال ہے (تلخیص تفہیم القرآن صفحہ ۵۲۴)

ان تمام اکابر اہلِ قلم نے اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا لیکن مولانا آزاد کے لکھنے پر وہ قیامت ڈھائی گئی کہ بڑے بڑے لوگ اپنے حواس کھو بیٹھے اور مولانا آزاد پر برہمو سماج اور گاندھی جی کی پیروی اور تائید کی پھبتیاں کسی جانے لگیں۔

پاکستان کی تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ایک اعتدال پسند مفکر و مصلح ہیں ڈاکٹر صاحب نے مولانا آزاد اور قرآنی دعوت پر جن تاثرات کا اظہار کیا۔ اس پر غور کیجئے۔

ڈاکٹر صاحب نے برصغیر کی تین شخصیتوں کو دعوت قرانی کا علم بردار قرار دیا (۱) ڈاکٹر محمد اقبال (۲) مولانا حمید الدین صاحب فراہی (۳) مولانا ابوالکلام آزاد مولانا کے متعلق لکھتے ہیں۔

برصغیر میں قرآنی فکر کا دوسرا دھارا مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت سے پھوٹا جس پر فکر سے زیادہ دعوت کا رنگ غالب تھا۔ مولانا مرحوم مفسرِ قرآن کی حیثیت سے تو بہت بعد میں متعارف ہوئے اس لئے کہ ترجمان القرآن کی جلد اول ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ شائع ہوئی تاہم ان کی قرآن حکیم کی ترجمانی اور قیام حکومت الٰہیہ کے لئے دعوتِ جہاد کا ڈنکا برصغیر کے طول و عرض میں ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۶ء اور البلاغ کے ذریعہ بج چکا تھا۔ الہلال اور اس ضمن میں وہ حضرت شیخ الہندؒ ایسی عظیم شخصیت تک سے خراج تحسین وصول کر چکے تھے۔ آگے لکھتے ہیں۔

"مزید افسوس یہ کہ گاندھی جی کی شخصیت کے زیر اثر مولانا مرحوم وحدت ادیان کے بھی پرچارک بن گئے اور اس طرح گویا برہمو سماج کی تقویت کا ذریعہ بن گئے تاہم الہلال اور البلاغ کی دعوت اتنی بودی اور بے جان نہ تھی کہ اس طرح ختم ہو جاتی چنانچہ اس کے فوراً بعد ایک دوسری فعال شخصیت کی صورت میں ظہور کر لیا اُس سے مولانا مودودی مراد ہیں جو ڈاکٹر صاحب کے نزدیک مولانا آزاد کے معنوی خلیفہ ہیں (حکمت قرآن لاہور ماہ اگست و جولائی ۱۹۸۲ء صفحہ ۲۹)

اس سے پہلے اسی پرچہ میں صفحہ (۳۳) پر یہ لکھا۔

عجیب مماثلت ہے کہ جس طرح راجہ رام موہن رائے (وفات ۱۸۳۳ء) نے اسلام اور مسلمانوں کی مدافعت میں تحفۃ الموحدین تالیف کی اسی طرح گاندھی جی مسلمانوں کی تالیف قلب کے لئے تحریک خلافت میں شمولیت اختیار کی اور وحدت ادیان کے فلسفہ کو اتنا اچھالا کر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم جیسی عظیم اور نابغہ روزگار شخصیت بھی ان کی زلف گرہ گیر کی اسیر ہو گئی ع

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

ڈاکٹر صاحب کا یہ تبصرہ ۸۲ء کے بعد تازہ حکمت قرآن ۸۷ء کے اندر دوبارہ شائع ہوا ہے۔

ڈاکٹر صاحب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کو اپنے عہد کا مجدد، مولانا آزاد کو شاہ ولی اللہ کے بعد دوسرا داعی قرآن اور مولانا حسین مدنی کو صاحب اتقاء و مقبول بارگاہ قرار دیتے ہیں لیکن اس مسئلہ میں مولانا آزاد کے وحدت دین کو وحدت ادیان بنا دیتے ہیں اور اس کا رشتہ برہمو سماج سے جوڑ دیتے

ہیں۔

وہ اس حقیقت کو قطعاً نظر انداز کر دیتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبد القادر صاحب نے وحدت دین پر جو کچھ لکھا ہے مولانا آزاد کے ہاں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

برہمو سماج ہو یا اکبر کا دین الٰہی..... ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ نجات کے لئے یہ ضروری نہیں کہ کسی خاص مذہب کی پیروی کی جائے 'اسلام ہو یا کوئی دوسرا دین دھرم' سب حق ہیں اور سب ہی نجات کی منزل کی طرف لے جاتے ہیں۔

مولانا آزاد نے دین کی وحدت پر الفاتحہ کی تفسیر میں صفحہ (۱۲۰) سے (۱۷۲) تک (۵۲) صفحات پر تفصیلی بحث کی ہے اور اس سے پہلے صفحہ (۱۱۹) پر صفات الٰہی کی بحث کو ختم کرتے ہوئے۔

اَشْهَدُ اَنْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُه

پر ایک صفحہ میں نبوتِ محمدی اور عبدیتِ محمدی پر جو جامع و مانع کلام کیا ہے وہ ایک غیر جانب دار قاری کو مطمئن کرنے کے لئے کافی ہے کہ مولانا آزاد نجات و فلاح کے لئے توحید کے ساتھ نبوت محمدی پر ایمان لانے کو لازمی اور ضروری قرار دیتے ہیں۔

غور کیجئے!

اسلام نے اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ جو قرار دیا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔

اشهد ان لا اله الا اللّٰه واشهد ان محمدا عبده وسوله

اس اقرار میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا ہے ٹھیک اس طرح پیغمبر کی بندگی اور درجہ رسالت کا بھی اعتراف ہے۔

غور کرنا چاہئے کہ ایسا کیوں کیا گیا؟..... صرف اس لئے کہ پیغمبر اسلامؐ کی بندگی اور درجہ رسالت کا اعتقاد اسلام کی اصل و اساس بن جائے کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خدا کی توحید کے ساتھ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بندگی اور رسالت کا بھی اقرار نہ کرے..... (صفحہ ۱۱۹)

الفاتحہ کی تفسیر کے بعد البقرہ سے سورہ مومنون تک بیسوں مقام ایسے آئے ہیں جہاں موقعہ کی مناسبت سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی ضرورت اور اہمیت پر پوری شدت اور عظمت کے ساتھ بحث کی ہے۔

ان تمام تصریحات کو نظر انداز کر کے مولانا آزاد کے تصور وحدت پر رائے زنی کرنا محتاط تبصرہ نگاری

کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

البتہ مولانا آزاد کی تحریر کا ایک مزاج ہے۔ مولانا جس موضوع پر گفتگو کرتے ہیں اس موضوع کے دائرہ کی سخت پابندی کرتے ہیں 'اگر اصول و اساس کی بحث ہے تو اس میں فروع و جزئیات کی گفتگو نہیں ہوگی۔

ڈاکٹر رضی الدین نے نقدِ ابوالکلام میں مولانا آزاد اور سرسید خاں مرحوم کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے مولانا آزاد کو انتہاپسند اور سرسید کو حقیقت پسند کہا اور وحدتِ دین کے مسئلہ میں مولانا آزاد کو انتہا پسند اور سرسید کو حقیقت پسند کہا ہے۔ اور وحدت دین کے مسئلہ میں مولانا آزاد کی اسی انتہاپسندی نے غلط فہمیوں کو راہ دی ہے۔ (۵۲) صفحات کی بحث میں اصول کی وحدتِ پر اس قدر شدت کے ساتھ زور دیا گیا ہے کہ اگر قاری اس بحث کو پڑھ کر کتاب رکھ دے اور ترجمان کے دوسرے مباحث اس کے ذہن میں نہ ہوں تو وہ غلط تاثر لے کر ہٹے گا..... لیکن اہل علم کی ذمہ داری ایک عام قاری سے زیادہ ہے 'اسے ترجمان کے مکمل مطالعہ کے بعد رائے قائم کرنی چاہئے۔

مولانا آزاد پر یہ الزام تھا کہ مولانا ہندوؤں کے ساتھ رواداری کے جذبہ میں (بقول ان کے) اسلام اور کفر کے درمیان وحدت کی باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ اسی جلد اول میں جس میں وحدتِ دین کی بحث ہے 'مولانا رواداری اور مداھنت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

رواداری یقیناً ایک خوبی کی بات ہے لیکن ساتھ ہی عقیدہ کی مضبوطی 'رائے کی پختگی اور استقامت فکر کی خوبیوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

پس یہاں حد بندی کا کوئی نہ کوئی خط ضرور ہونا چاہئے جو ان تمام خوبیوں کو اپنی اپنی جگہ رکھے۔

اخلاق کے تمام احکام انہیں حد بندیوں کے خطوط سے بنتے اور ابھرتے ہیں جوں ہی یہ ہلنے لگتے ہیں' اخلاق کی پوری دیوار ہل جاتی ہے (ترجمان جلد اول ۱۷۸) بے اعتدال اور انتہاپسند مخالفین نے اس مظلوم انسان پر کیا کیا ظلم ڈھائے اور اس نے اپنی اعلیٰ ظرفی اور سیادت نسبی کا کتنا شاندار مظاہرہ کیا..... یہ تاریخ کا ایک عبرتناک باب ہے۔

تکمیل شریعت کا اثبات

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں مختلف موقعوں پر شریعت اسلامیہ کی تکمیل کا اثبات پوری شدت و عظمت کے ساتھ کیا ہے۔

ایک جگہ تقلید جامد کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ (باقی ص ۳۸ پر)

توضیح وتنقیح

مرویاتِ خطیب بغدادیؒ اور سیرتِ امام ابوحنیفہؒ

نصرت علی اثیر

'سیرت عبداللہ بن مبارکؒ' پر محترم نصرت علی اثیر کا ایک وقیع تحقیقی مقالہ گزشتہ سال کے دوران 'حکمتِ قرآن' میں بالاقساط شائع ہوتا رہا ہے۔ علمِ فقہ میں حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ کے مقام و مرتبے کا ذکر کرتے ہوئے محترم مقالہ نگار نے خطیب بغدادیؒ کی بعض ایسی روایات بھی اپنے مقالے میں درج کی ہیں جن سے یہ تأثر ملتا ہے کہ حضرت ابن مبارکؒ اُخری ایّام میں حضرت امام ابوحنیفہؒ سے مروی علوم اور آپ کی شخصیت سے بدظن ہو گئے تھے۔ ہمارے بعض قارئین کو فطری طور پر (۱) سے اشکال پیدا ہوا جس پر محترم نصرت علی اثیر صاحب نے یہ وضاحتی مقالہ تحریر فرمایا ہے جو ہدیۂ قارئین ہے۔ (ادارہ)

احمد بن علی بن ثابت بن احمد بن مہدی ابوبکر خطیب البغدادی (۳۹۱ھ ۴۶۳ھ) تاریخ اسلام میں علم و ادب کے حوالہ سے ایک کثیر التصانیف شخصیت مانے جاتے ہیں۔ آپ نے تاریخ، حدیث اور فقہ کے علوم میں چھپن اور ایک دوسری روایت کے مطابق ایک سو کتب تصنیف کیں۔ جن میں "تاریخ بغداد" کو علم و تحقیق کی دنیا میں بڑی شہرت حاصل ہے، یہ کتاب چودہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ مصر سے ۱۳۴۹ھ میں اس کی اشاعت شروع ہوئی۔ کتاب میں شہر بغداد کی ۴۶۳ھ تک کی علمی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ بڑے عمدہ اور معیاری طریقے سے محفوظ کر دی گئی ہے، طرزِ بیان کے لحاظ سے اسے مسلمان مؤرخین کی تصانیف میں بڑا اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ الفاظ بقدرِ معانی استعمال کئے گئے ہیں۔ عبارات آرائی اور مدح سرائی سے ہٹ کر علماء کے تذکرے جرح و تعدیل میں بے لاگ ہیں۔ جملہ روایات محدثانہ ہیں اس کو اپنی ترتیب کے لحاظ سے تاریخ رجال کا اہم تذکرہ کہا جا سکتا ہے۔ جس میں مفسرین، محدثین اور فقہاء سے لے کر شعراء، مصنفین اور اہلِ صنعت کے سب

کا ذکر ملتا ہے اور اس طرح ۸۳۱ مشاہیر رجال کے تذکروں کو اس میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ (۸۰ - ۱۵۰ھ) کا تذکرہ بڑی شرح وبسط کے ساتھ اس میں دیا گیا ہے۔ تذکرہ کے آخر میں چند روایات ایسی دے دی گئی ہیں جن سے آپ کی شخصیت پر نقد وجرح کے بڑے ترش چھینٹے پڑتے ہیں[۱]۔ حالانکہ یہ نقد نامور ائمہ رجال میں سے کسی نے بھی قبول نہیں کیا۔ امام ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ"[۲] میں امام اعظم کے حالات ومناقب بیان کئے ہیں لیکن جرح کی کسی روایت کو قبول نہیں کیا بلکہ ان کی جلالتِ شان کے پیش نظر یہ لکھ دیا کہ اس تذکرہ سے ہٹ کر امام اعظم کے مناقب میں ایک کتاب جداگانہ لکھ دی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے "تہذیب التہذیب"[۳] میں حالات ومناقب لکھنے کے بعد اس دعا سے ختم کلام کیا "مَنَاقِبُ اَبِیْ حَنِیْفَہ کَثِیْرَۃٌ جِدًّا فَرَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ وَاَسْکَنَہُ الْفِرْدَوْس۔ آمین۔ اسی طرح آپ نے "تقریب التہذیب" میں بھی کسی جرح ونقد کو ذکر نہیں کیا۔ حافظ صفی الدین خزرجی نے "خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال"[۴] میں امام صاحب کو "اِمَامُ الْعِرَاقِ وَفَقِیْہُ الْاُمَّۃ" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ یہ وضاحت بڑی قابل قدر ہوگی کہ "خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال" چار کتابوں کے مطالب پر مشتمل ہے جن میں خود امام خزرجی کا خلاصہ "تذہیب" للامام ذہبی، تہذیب الکمال از امام ابوالحجاج المزی، اور الکمال فی اسماء الرجال از امام عبدالغنی نابلسی شامل ہیں۔ اس طرح یہ مسلک جرح وتعدیل کے چار اماموں کا متفقہ مسلک کہا جاسکتا ہے۔ "کتاب الکمال فی اسماء الرجال" از عبدالغنی نابلسی کو نقد رجال میں اہم تصنیف کہا جاتا ہے۔ حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب کے خطبے میں لکھا ہے:[۵]

"کتاب الکمال فی اسماء الرجال ... من اجل المصنفات فی معرفۃ حملۃ الاثار وضعًا واعظم المؤلفات فی بصائر ذوی الالباب وقعًا۔

اور خطبے کے آخر میں مؤلف الکمال کی بابت لکھا ہے۔

"ھو واللّٰہ لعدیم النظیر المطلع التحریر۔"

امام نوویؒ نے "تہذیب الاسماء واللغات" میں امام صاحب کے مناقب میں سات صفحے رقم کئے ہیں۔ جن کا اکثر حصّہ تاریخ خطیب بغدادی سے لیا گیا ہے صرف مناقب کو لیا ہے اور نقد و جرح کو ترک کر دیا ہے۔ "مرأۃ الجنان" میں امام یافعی شافعی نے خطیب بغدادی کی تاریخ سے امام صاحب کے صرف مناقب لئے ہیں اور نقد و جرح کو بالکل قبول نہیں کیا۔ فقیہ ابن الحماد الحنبلی نے بھی اپنی کتاب میں صرف حالات و مناقب لکھے ہیں کسی قسم کی کوئی جرح نقل نہیں کی۔ مذکورہ بالا جملہ ائمہ کا یہ رویہ اس بات کی شہادت کے لئے کافی ہے کہ تاریخ بغدادی میں دی جانے والی نقد و جرح کی جملہ روایات موضوع اور متروک تھیں۔ اور اس کی شہادت خود خطیب بغدادی کی اس عبارت سے ملتی ہے جو انہوں نے امام صاحب کے تذکرہ میں نقد و جرح کی روایات نقل کرنے سے پہلے لکھی ہے۔

" والمحفوظ عند نقلة الحديث عن الائمة المتقدمين و هٰؤلاء المذكورين منهم في ابي حنيفة خلاف ذلك و كلامهم فيه كثير لامور شنيعة۔ حفظت عليه يتعلق بعضها باصول الديانات، وبعضها بالفروع، نحن ذاكروها بمشية الله ومعتذرون على من وقف عليها وكره سماعها، بان اباحنيفة عندنا مع جلالة قدره اسوة غيره من العلماء الذين دوّنا ذكرهم في هٰذا الكتاب، واوردنا اخبارهم، وحكينا اقوال الناس فيهم على تباينها والله الموفق للصواب"

یعنی ناقلانِ حدیث کے یہاں ائمہ مذکورین کے ایسے اقوال بھی ابو حنیفہ کے متعلق محفوظ ہیں جو بیان بالا کے خلاف ہیں، اور انہوں نے ان کی بابت کلام بہت کیا ہے۔ اس کلام کے باعث وہ اُمور شنیعہ ہیں جو ان کے متعلق محفوظ ہیں۔ ان میں بعض تو اصول دین کے متعلق ہیں اور بعض فروع کے متعلق ہم انشاء اللہ ان کا ذکر کریں گے جو لوگ اس کو سنکر ناپسند کریں ان سے ہم معذرت کرتے ہیں کہ ہم ابو حنیفہ کی جلالت قدر کے قائل ہیں۔ تاہم انکو اس بارہ میں دوسرے علماء کی طرح سمجھتے ہیں کہ ان کے خلاف جو باتیں بیان

کی گئی ہیں، ان کو بھی ہم بیان کردیں جیسا کہ ہم نے دوسرے علماء کے ذکر میں کہا ہے۔"

مندرجہ بالا تمہیدی بیان میں خطیب بغدادی نے جن امور شنیعہ کا اشارہ کیا ہے وہ عقائد کے حوالہ سے حسب ذیل اقوال ہیں۔

۱۔ یہودی، مشرک، زندیق، دہری، صاحب ہوا کو ان کے کفر سے دوبارہ توبہ کروائی گئی۔

۲۔ مرجیہ، جہمی، خلق قرآن کے قائل اور اصحاب ابوحنیفہ کا شبہ بالنصاریٰ ہونا۔

فروع کے حوالہ سے حسب ذیل اقوال آپ سے منسوب کئے گئے ہیں۔

۱۔ خروج علی السلطان (۲) تقیہ کرنا، (۳) زنا کا حلال کرنا

۴۔ خونریزی حلال کرنا، (۵) سُنن کی کساد بازاری کی وغیرہ وغیرہ

مندرجہ بالا جرحیں سب کی سب غیر مفسر اور غیر مبین السبب ہیں ان کے راویوں کی عدالت کی توثیق خطیب نے کہیں نہیں کی۔ اور تمام نامور ائمہ رجال کی کتب میں ان راویوں کی عدالت وثقاہت کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ زیادہ مجہول الحال اور متعصب الوجود ہیں۔

امام صاحب کے حوالہ سے جن عقائد کی مذمت کی گئی ہے، وہ کسی نامور امام رجال نے تسلیم نہیں کئے خود خطیب بغدادی ان کے تسلیم کرنے سے گریزاں ہیں۔ بلکہ جرحیں نقل کرتے وقت آپ کی تعدیل کا بھی کہیں کہیں ذکر کر جاتے ہیں مثلاً خلق قرآن کے عقیدہ کی روایت بیان کرنے کے بعد امام احمد بن حنبل کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

"لم یصح عندنا ان ابا حنیفہ کان یقول القرآن مخلوق"

اس کے بعد ابوسلیمان جوزجانی اور معلی بن منصور کا قول نقل کر دیا کہ:

"ما تکلم ابوحنیفہ ولا ابو یوسف ولا زفر ولا محمد ولا احد من اصحابھم فی القرآن وانما تکلم فی القرآن بشر المریسی وابن ابی داؤد فھؤلاء شانوا اصحاب ابی حنیفہ"

اسی کے ساتھ پھر خطیب بغدادی نے خود امام صاحب کا ایک قول نقل کر دیا

کہ ایک بار عبداللہ بن مبارکؒ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے پاس گئے اور آپ نے پوچھا کہ تم لوگوں میں یہ کیا چرچا ہو رہا ہے تو آپ نے جواب دیا کہ ایک شخص جہم نامی کا چرچا ہے تو پوچھا کیا کہتا ہے تو حضرت عبداللہ بن مبارک نے جواب دیا کہ وہ کہتا ہے "القرآن مخلوق" تو آپ نے سن کر یہ آیت پڑھی۔

"کَبُرَتْ کَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا کَذِبًا"[۱۱]

اسی طرح جنت اور نار کے غیر موجود ہونے کے بارے آپ پر جرح نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ خود راوی ابومطیع اس کا قائل تھا اور حضرت امام ابوحنیفہ اس عقیدہ کے قائل نہ تھے[۱۲] امام احمد بن حنبل کی طرف سے جو جرح امام صاحب کے کذاب ہونے کی منسوب ہے اس کو نقل کرنے کے بعد یحییٰ بن معین کا قول نقل کر دیا جس میں آپ سے پوچھا گیا کہ کیا امام ابوحنیفہ ثقہ ہیں۔ تو آپ نے دو بار ثقہ ثقہ کہا۔ اور دوسرا قول نقل کیا کہ آپ ثقہ تھے اور صرف وہی حدیث روایت کرتے تھے جو ان کو بخوبی یاد ہوتی اور جو بخوبی یاد نہ ہوتی اس کو بالکل روایت نہ کرتے تھے[۱۳]

ان مقامات کو دیکھ کر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ خطیب بغدادی نے یہ اقوال نقل کر کے اپنا مورخانہ فرض ادا کرنے کی کوشش کی ہے جب کہ وہ خود ان کے قائل نہ تھے اور نہ ہی انہیں ان راویوں کی ثقاہت پر یقین تھا۔

اصول حدیث کی مستند کتابوں سے اگر اس نقد و جرح کو دیکھیں تو اس کا بڑا شافی و کافی جواب مل جاتا ہے۔ "کتاب المغنی" میں شیخ طاہر پٹنی حنفی نے مشہور محدث ابن الاثیر جزری شافعی کی ایک عبارت ان کی کتاب جامع الاصول سے نقل کی ہے۔ جس کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"امام ابوحنیفہ کی طرف ایسے اقوال منسوب کئے گئے ہیں جن سے ان کی شان بالاتر ہے۔ وہ اقوال خلق قرآن، قدر، ارجاء وغیرہ ہیں۔ ہم کو ضرورت نہیں کہ ان اقوال کے منسوب کرنے والوں کے نام لیں، یہ ظاہر ہے کہ امام ابوحنیفہ کا دامن ان سے پاک تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ان کو ایسی شریعت کا دینا جو سارے آفاق میں پھیل گئی اور جس نے

روئے زمین کو ڈھک لیا اور ان کے مذہب و فقہ کو قبول عام ان کی
پاکدامنی کی دلیل ہے ۔ اگر اس میں اللہ تعالیٰ کا سرّ خفی نہ ہوتا ۔ نصف
یا اس کے قریب اسلام ان کی تقلید کے جھنڈے تلے نہ ہوتا ۔ یہاں تک

کہ ہمارے زمانے تک ساڑھے نوسو برس ہو گئے ہیں ۔ اور ان کی فقہ کے مطابق عبادت ہورہی ہے ۔ اور ان کی رائے پر عمل ہورہا ہے جو اس کی صحت کی اوّل درجے کی دلیل ہے ۔ اور امام ابوجعفر طحاوی نے کتاب "عقیدہ ابوحنیفہ" لکھی ہے جو اہل سنت کے عقائد کی مظہر ہے ۔ اور ان عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ موجود نہیں جو امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب کر دیئے گئے ہیں ۔ اور امام طحاوی نے ان عقائد کے غلط طور پر منسوب کرنے کی وجوہات کا ذکر کر دیا ہے"[۱۴]

خطیب بغدادی نے اپنی کتاب "الکفایہ فی علم الروایہ" میں جرح کے قاعدہ کے تحت امام مالک بن انس اور سفیان ثوری سے شروع کرکے یحییٰ بن معین تک ایک طبقہ قائم کیا ہے اور اسکے بعد لکھا کہ جو اصحاب بلندی ذکر، استقامت حال، صداقت کی شہرت اور بصیرت و فہم میں اصحاب بالا کی مثل ہوں، ان کی عدالت کی بابت سوال نہیں کیا جا سکتا "

اس قول کے ثبوت میں انہوں نے ایک روایت ذکر کی کہ امام احمد بن حنبل سے اسحٰق بن راہویہ کی بابت سوال کیا گیا تو آپ نے جواب میں کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اسحٰق بن راہویہ کی شان کے آدمی کی بابت کوئی سوال کرے ۔ غرض اسی طرح کے خطیب نے کئی اقوال یحییٰ بن معین، امام بخاری اور امام مسلم کے حوالہ سے نقل کئے ہیں ۔ اس قاعدہ کی رو سے اگر دیکھیں تو یہ بڑا واضح امر ہے کہ اسحٰق بن راہویہ کی شان اگر سوال کی متحمل نہیں تو حضرت امام ابوحنیفہ کی جلالت تو کہیں زیادہ متقاضی ہے ۔

طبقات الشافعیہ میں حضرت شیخ سُبکی نے جرح و تعدیل کا ایک اصول طے کیا ہے ۔ اور لکھتے ہیں :-

"ہمارے نزدیک قول صواب یہ ہے کہ جس کی امامت و عدالت ثابت ہو
اور جس کی تعدیل و تزکیہ کرنے والے بہت ہوں اور جرح کرنے والے

شاذ ہوں نیز اس بات کا قرینہ ہو کہ سبب جرح تعصب مذہبی کی وجہ سے ہے تو ہم جرح کی طرف التفات نہیں کریں گے - اور تعدیل کو مان لیں گے - کیونکہ اگر یہ دروازہ کھول دیا جائے جس میں جرح کو تعدیل پر مقدم مان لیں تو کوئی امام اس کی زد سے بچ نہیں سکے گا - کیونکہ کوئی امام ایسا نہیں جس پر طعن کرنے والوں نے طعن نہ کیا ہو"۔

اسی طرح ابن عبدالبر کا قول صائب ہے کہ جس شخص کی عدالت امامت اور علم کی جانب توجہ ثابت ہو اس کے متعلق کسی نقد یہ قول کی طرف التفات نہیں کیا جا سکتا - تاہم اس صورت میں جب جرح عادلانہ جرح شہادت کے قاعدوں پر پوری ہو تو اس کو دیکھا جا سکتا ہے - سلف میں بعض کا کلام بعض پر رہا ہے - بعض حالتوں میں وہ کلام تعصب یا حسد پر مبنی ہے اور بعض صورتوں میں تاویل و اختلاف و اجتہاد اس کا باعث ہوا ہے - حالانکہ جس کی نسبت کلام کیا جاتا ہے وہ اس سے پاک ہوتا ہے"۔

مذکورہ بالا اصول کی تائید شیخ الاسلام تقی الدین ابن دقیق العید نے اپنی کتاب "الاقتراح" امام نووی نے اپنے رسالہ اصول حدیث "التقریب" اور حافظ ابن صلاح نے اپنے مقدمہ میں کی ہے - اور اسی عظمت کے پیش نظر خطیب بغدادی کی امام صاحب کے نقد میں دی جانیوالی جملہ روایات کو مسترد اور متروک و غیر مقبول قرار دیا ہے - اور کسی نے بھی جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے' اپنی کتاب میں اس جرح کو قبول نہیں کیا - علامہ زاہد الکوثری نے خطیب بغدادی کی جرح کے جواب میں پوری کتاب " تانیب الخطیب علی ما ساقه فی ترجمة ابی حنیفه من الاکاذیب" اور ایک رسالہ جو اس کے نقد کے جواب میں " التر هیب بنقد التانیب" کے نام سے لکھا ہے - اور ہر روایت پر اسکی سند اور مضمون سے سیر حاصل بحث کر کے رد کر دیا ہے اس کے علاوہ ایک رسالہ عیسی بن ایوب سے اس سلسلہ میں بعنوان " السهم المصیب فی الرد علی الخطیب" منقول ہے جس کے تا ہنوز چھپنے کی تصدیق نہیں ہو سکی - عمر رضا کی کحالہ نے اس کا تذکرہ اپنی مشہور

کتاب معجم المؤلفین میں ظاہریہ کے مخطوطات کی فہرست کے حوالہ سے کیا ہے[۱۵]۔ اردو زبان میں جناب حافظ حبیب الرحمٰن شیروانی کی کتاب "امام ابوحنیفہ اور ان کے ناقدین" اس سلسلہ میں ایک اہم تحقیقی کوشش ہے۔ امید ہے کہ مذکورہ کتب سے اس موضوع کے بارے میں تفصیلی مطالعہ کرنے والے قارئین کی یقیناً تشفی ہو جائے گی۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے منسوب روایات میں حسین بن عبداللہ النیا پوری، عبدالواحد بن علی الغامی، ابوالعباس السراج مجہول الحال اور ابن رزق، ابن مسلم، الدبار اور حمیدی کی حضرت عبداللہ بن مبارک سے روایت رجال کی کتب میں کہیں بھی تسلیم نہیں کی گئی۔ اس طرح عبداللہ بن عمر الواعظ، محمد بن احمد بن یعقوب اور ابن دوما جیسے راویوں کا ذکر کسی قابل اعتبار تذکرے میں نہیں ملتا۔ بنا بریں ان روایات کی حیثیت مشکوک اور ناقابل تسلیم ہے۔

---

۱ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد ۱۳: ص ۳۲۳ ص ۴۵۴ مطبوعہ طبقہ السعادہ مصر ۱۹۳۱ء

۲ ذہبی تذکرۃ الحافظ ۱: ۱۲۸ مطبوعہ مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد دکن ۱۹۵۵ء

۳ ابن حجر عسقلانی۔ تہذیب التہذیب ۱۰: ۴۴۹ مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۵۲ء

۴ ابن حجر عسقلانی۔ تقریب التہذیب ص ۳۵۸ مطبوعہ دارالکتاب مصر ۱۳۸۰ھ

۵ خزرجی، احمد بن عبداللہ تذہیب الکمال ص ۳۴۵ مطبوعہ طبقۃ الخیریہ قاہرہ ۱۳۲۲ھ

۶ ابن حجر۔ تہذیب التہذیب ص مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۵۲ء

۷ نووی۔ تہذیب الاسماء واللغات مطبوعہ مصر

۸ یافعی، عبداللہ بن اسعد بن علی۔ مرآۃ الجنان وعبرۃ الیقضان۔ مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۳۷ھ ص ۳۱

۹ ابن الحماد الحنبلی۔ شذرات الذہب فی اخبار من ذہب مطبوعہ قاہرہ ۱۳۵۰ھ

۱۰ خطیب بغدادی تاریخ بغداد ۱۳ = ۳۶۹ مطبوعہ مطبعہ السعادہ مصر ۱۹۳۱ء

۱۱ خطیب بغدادی - تاریخ بغداد - ۱۳ : ۳۷۷ مطبوعہ مصر ۱۹۳۱ء
۱۲ خطیب بغدادی - تاریخ بغداد - ۱۳ : ۳۷۸ " " "
۱۳ خطیب بغدادی - الکفایہ فی علم الروایہ ص۱۰۱ تا ۱۰۶ مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۳۵۷ھ
۱۴ السبکی، عبدالوہاب بن تقی الدین - طبقات الشافعیہ الکبریٰ - قاہرہ مطبعہ حسینیہ (س - ن) جزو اول ص۱۸۷ تا ۱۸۹،
۱۵ عمر رضا کحالہ - معجم المولفین - ۱۳ : ۱۰۴ مطبوعہ دمشق ۱۳۷۶ھ

فہمِ قرآن

اور

خصوصاً قرآن کے منضبط اور مربوط مطالعہ کے ضمن میں ـــــ

ڈاکٹر اسرار احمد

کی نشری (ریڈیو) تقاریر پر مبنی ایک اہم تصنیف

قرآن مجید کی سورتوں کا اجمالی تجزیہ

(سورہ الفاتحہ تا سورہ الکہف)

ضرور مطالعہ کیجئے

بقیہ: درس سورۃ محمدؐ

سماوی کے ذریعہ سے رسول آخر الزماں کی تکذیب کرنے والوں کو آن واحد میں ملیامیٹ کر دیا جائے۔ حضرت محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین اور آخر المرسلین ہیں۔ آپؐ کا دورِ رسالت تاقیام جاری رہے گا اور تم آخری امت ہو تمہیں تو برپا ہی اس لئے کیا ہے کہ تم اللہ کے دین کا جھنڈا پورے کرہ ارض پر گاڑو۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کو محض ان مشرکین کی سرکوبی کرنی ہوتی تو وہ آن واحد میں ایسا کر سکتا تھا۔ لیکن اب اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ تمہارے ہاتھوں ان کو کیفر کردار تک پہنچائے اور رہتی دنیا تک تم شہادت علی الناس کا فریضہ انجام دیتے رہو۔ دنیا کو حق کی دعوت دیتے رہو لوگوں کو حق کی طرف پکارتے رہو۔ اور اس کام میں اپنے مال اور اپنی جان قربان کرتے رہو۔

ایک وسوسہ کا ازالہ

یہاں دل میں شیطان ایک وسوسہ ڈال سکتا ہے کہ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ یہ آزمائش تو اللہ تعالیٰ کا ایک کھیل ہو گیا۔ جانچا جا رہا ہے۔ پرکھا جا رہا ہے اور جو لوگ مارے گئے اور اپنی جان سے گئے ان کو کیا ثمرہ ملا! غزوہ بدر میں جہاں مشرکین کے ستّر افراد مقتول ہوئے وہاں مسلمانوں کے بھی تیرہ ساتھی شہید ہوئے..... تیرہ اہل ایمان تو میدان جنگ ہی میں شہید ہوئے اور حضرت عبیدہ ابن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو میدان میں شدید زخمی ہو گئے تھے ان کی ٹانگ کٹ گئی تھی، انہوں نے مدینہ مراجعت کے دوران راستہ میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی۔ اس طرح غزوہ بدر کے شہداء کی تعداد چودہ ہو گئی۔ اب دل میں وسوسہ آ سکتا ہے کہ اس جانچ پرکھ میں بھی چودہ شہید کرا دیئے گئے۔ اس کا ازالہ ہے جو آیت زیر مطالعہ کے آخر میں بایں الفاظ آیا ہے وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں" اللہ ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا اگر صرف دنیا کا معاملہ ہوتا تو جو مقتول ہوئے، ان کے ہاتھ تو کچھ بھی نہیں آیا۔ لیکن اگر یہ یقین ہے کہ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ اصل زندگی کا گھر تو دار آخرت ہے اور ساتھ ہی یہ بشارت بھی ہو کہ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا

نَشْعُرُوْنَ ○ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں انہیں مردہ نہ کہو' ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں' لیکن تم اس زندگی کا شعور نہیں رکھتے۔ اور وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ○ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں ان کو مردہ نہ سمجھو۔ وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں" فَرِحِیْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اس پر خوش و خرم ہیں۔ " انہی بشارتوں نے اہل ایمان کے دلوں میں اتنا زبردست جذبہ عمل پیدا کیا تھا کہ غزوہ احزاب کے موقع پر جب سخت سردی کا عالم تھا وہ مدینہ کی سنگلاخ زمین میں خندق کھودتے وقت یہ ترانہ پڑھ رہے تھے۔

اَللّٰهُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَة

یہی ہے ایمان بالآخر کا لب لباب کہ اصل زندگی' اصل عیش و آرام اصل کامیابی تو آخرت کی زندگی ہے۔ تو دیکھو تمہارے دل میں ہرگز یہ وسوسہ اور یہ خیال نہ آئے کہ راہ حق میں جان دینے والے ناکام ہوئے اور خسارے میں رہے۔ جان رکھو کہ وَالَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَلَنْ یُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ○

(جاری ہے)

ڈاکٹر اسرار احمد

نے اپنی دوسری دینی اور علمی خدمات کیساتھ ساتھ شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں

ایک اصلاحی تحریک

بھی برپا کی اور خطبۂ نکاح کو صرف ایک رسم

کی بجائے واقعی تذکیر و نصیحت اور معاشرتی زندگی سے متعلق اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کا ذریعہ بنایا

اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی ایک اہم تحریر اور ایک خطبۂ نکاح کو دیدہ زیب کتاب کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔

بڑے سائز کے ۴۸ صفحات ○ عمدہ دبیز کاغذ ○ دیدہ زیب کور

ہدیہ: ۴ روپے ——— محصول ڈاک علاوہ

نبی اکرمؐ کی اصل جلالت قدر اور عظمت شان کو
کوئی نہیں جان سکتا۔ مختصر یہی کہا جا سکتا ہے کہ

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"

ہمارے لیے اصل قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ:۔
کیا ہم آپؐ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں؟
اس لیے کہ اسی پر ہماری نجات کا دار و مدار ہے

اِس اہم موضوع پر
ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف
نبیِّ اکرمؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے

ہمارے تعلّق کی بنیادیں

کا خود بھی مطالعہ کیجیے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجیے

ھدیہ فی نسخہ: تین روپے۔ تبلیغی مقصد کے لیے یک صد نسخوں پر ۳۳ فی صد کمیشن دیا جائے گا:

Regd No. ... No. 6193

MONTHLY

HIKMAT-E-QURAN

LAHORE

VOL. 6

NO. 10

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ایسے اہم موضوعات پر

[illegible]